ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۱۷

دوسرا سال: پانچویں کتاب

مئی ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

فون: 061-523486 / 0300-9638516

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ سجاد انصاری اور عظمت اللہ خاں..... — ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن — ۵

۳۔ رفیق غزنوی ___ منٹو کا ایک کردار — ڈاکٹر شگفتہ حسین — ۱۱

۴۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات ۷) — ابنِ حسن — ۲۱

کہانی:

۵۔ دہ سوختہ (ایرانی کہانی کا اردو روپ) — علی یار پور مقدم / رشید قیصرانی — ۳۴

شخصیات:

۶۔ ڈاکٹر رانا محمد نصر اللہ احسان الٰہی — جاوید اختر بھٹی — ۳۸

۷۔ اُجالے مر نہیں سکتے — محمد فیروز شاہ — ۴۲

تبصرہ:

۸۔ ''سوال یہ ہے؟'' — ڈاکٹر انور سدید — ۴۶

غزلیات:

۹۔ قاضی حبیب الرحمٰن (غزل)، غلام حسین ساجد (چار غزلیں)، خاور اعجاز (چار غزلیں)، فہیم شناس کاظمی (دو غزلیں)، حصیر نوری (دو غزلیں)، پرویز ساحر (چار غزلیں)، محمد فیروز شاہ (غزل)، غائر عالم (غزل)، افتخار شفیع (دو غزلیں)، اسلم سحاب ہاشمی (تین غزلیں)، ظفر اقبال نادر (غزل)، راؤ وحید اسد (دو غزلیں) — ۴۸-۶۳

نظمیں:

۱۰۔ گوانتاناموبے.....کالا پانی (یونس جاوید) آئینہ خانے کا قیدی (احمد صغیر صدیقی)، نیا فکری تجزیہ (خیال امروہوی)، بے روزگاروں کو دیکھ کر (خیال امروہوی)، یادِ ماضی (سجاد مرزا)، بخت خان آنکھ اُٹھاؤ (محمد انور خالد)، وہی اسبابِ بغاوت لکھے (محمد انور خالد)، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے (دل نواز دل)، سمپورن سمپورن منوا (یونس متین)، داستان گو (یونس متین)، ہرجائی (غائر عالم)، شہر کی تنہائی (خالد ریاض خالد) — ۶۴-۷۵

حروفِ زر (قارئین کے خطوط):

۲۰۔ بنام مرتب — ۷۶

سید عامر سہیل

چند باتیں

تاریخی حقائق کے معروضی مطالعہ اور اس میں شامل کرداروں کے افعال کا تعین فوری طور پہ کرنا تو شاید ممکن نہیں ہوتا تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کردار اور ان کے افعال اپنی اصل شکلوں میں آنے لگتے ہیں۔ گزرتے ہوئے حالات میں واقعات اور کرداروں کو صحیح جگہ رکھ کر دیکھنا ناممکن نہ سہی مگر آسان بھی نہیں ہوتا، تاریخ ان واقعات اور کرداروں کو ایک وقت میں اپنے اصل مقام پر ضرور لا کھڑا کرتی ہے۔ گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی سطح پر جو کچھ ہوا، فکری حوالوں سے جو تحریکیں سرگرمِ عمل رہیں اور ان میں کرداروں کے افعال جس طرح سرانجام پائے آج اُس کا تعین کرنے میں کچھ زیادہ مشکل پیش نہیں آ رہی۔ واضح نظر آ رہا ہے کہ کون سے کردار اپنی ''پارسائی اور حق گوئی'' کا ڈھول پیٹنے والے تھے اور پھر وہ کن کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہوئے۔ بظاہر سچے، دھلے دھلائے، پاکیزہ اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والے کس طرح لمحوں میں کسی طاقت ور آواز کی طرف سے جاری کردہ ہدایت پر اپنی ایڑیوں پر پھر گئے۔ یہ سب ہمارے سامنے ہے۔ کچھ یہی صورتِ حال ترقی پسند تحریک اور اُس میں شامل بعض ''پُر جوش انقلابیوں'' کے ہاں بھی نظر آتی ہے جو آج اشرافیہ کے کلچر میں بیٹھ کر اپنی گفتگو اور دانش ورانہ مکالموں میں وہی زبان استعمال کرتے نظر آ رہے ہیں جو طاقت وروں کے ایجنڈوں میں شامل ہے۔ اکثر ''انقلابی'' تو غیر سرکاری تنظیموں سے وابستہ ہو کر ایک نئے پُر آسائش اشرافیہ کے نظام کا نہ صرف حصہ ہیں بلکہ اُسے سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ عدم توازن اور عدم مساوات جیسے مسائل کی بجائے آج وہ دلکش اور درآمد شدہ دانشورانہ اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ سیکولرازم، ہیومن ازم، لبرل ازم اور اس انداز کی بہت سی اصطلاحات نئی تعبیروں کے ساتھ اُن کی زبانوں پر رواں ہیں۔

بیان کردہ باتوں کا محرک دراصل ایک غیر سرکاری تنظیم کی طرف سے جاری کردہ ایک رسالے کا اداریہ ہے۔ ترقی پسند فکر کے ''نئے مفہوم'' کو جس طرح اور جس انداز سے من چاہے معنی اور مطالب پہنائے جا رہے ہیں وہ نہ صرف دلچسپ بلکہ اُس سے بڑھ کر عبرت انگیز بھی ہیں۔ آج ہر ایشو کو ''روشن خیال'' اور ''ترقی پسند'' کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ طاقت وروں کے ایجنڈے میں شاید ان کرداروں کے افعال اسی انداز سے متعین کیے گئے ہیں۔ ترقی پسندی کیا ہے؟ اس کا حقیقی مفہوم کیا بنتا ہے؟ اور آج کی سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی صورت حال میں ترقی پسند فکر کس طرح اپنا حقیقی کردار ادا کر سکتی ہے؟ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ اُس ''ترقی پسندی'' کی تعبیر کی جائے جو سرمایہ دارانہ اور سامراجی ایجنڈوں میں سرِفہرست ہے۔

ترتیب وتعارف: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

سجاد انصاری اور محمد عظمت اللہ خاں

کے دو اہم اور نادر خط، بنام: خواجہ منظور حسین (علیگ)

سجاد انصاری (ولادت: گدیہ، ضلع بارہ بنکی ۱۶-مارچ ۱۸۹۴ء، وفات: گدیہ، ۲۹-جولائی ۱۹۲۴ء) کی معرکتہ الآراء کتاب ''محشرِ خیال'' مرتبہ خواجہ منظور حسین علیگ (ولادت دہلی ۳۱-مئی ۱۹۰۴ء، وفات: لاہور ۲۰-اگست ۱۹۸۶ء)، الیاس تحیمی (۱) (وفات: کراچی ۲-جنوری ۱۹۵۸ء) کی توجہ سے ۱۹۲۶ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی ___ اور آتے ہی بندھے ٹکے روایتی ادبی منظر نامے کو غیظ وغضب سے برما اور گرما گئی ___ لیکن انشائی ادب کی اپنے وقت کی حد درجہ ''گردن زدنی'' ہونے کے باوجود یہ دست شکن اور جرأتِ فکر کی حامل، ایک خیال افروز کتاب کے طور پر اسے بھول جانا یا بھلا دینا ممکن ہی نہیں (۲)۔

وفورِ تخلیق سے مالا مال، سجاد انصاری، عبدالرحمٰن بجنوری (ولادت: سیوہارہ، ۱۰-جون ۱۸۸۵ء، وفات: ۷-نومبر ۱۹۱۸ء) عظمت اللہ خان (ولادت: دہلی یکم جنوری ۱۸۸۷ء، وفات: مدن پلی، مدراس ۱۴-اکتوبر ۱۹۲۷ء)، بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے ہمارے تین بڑے ذہین قلم کار تھے۔ انہوں نے سن وسال کے اعتبار سے بہت مختصر مہلت اور عمر طبعی پائی ___ تینوں کو بہت کم عرصۂ حیات ملا۔ سجاد انصاری نے صرف تیس برس کی عمر پائی ___ بجنوری (۳) کا انتقال ہوا تو وہ صرف تینتیس سال کے تھے ___ عظمت اللہ خاں، عمرِ عزیز کے چالیسویں برس میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

''شب وروز وماہ وسال'' کی کم مہلت پانے کے باوصف، اپنے شعلۂ تخلیق، اپنے بالیدہ اور منفرد طرزِ احساس اور اپنی جرأتِ اظہار، اپنی ذکاوت وذہانت اور روشن خیالی کے باعث ان تینوں کے نام عظمتِ ابدی کے تاج سے جڑے ہوئے ہیں ___ تینوں صاحب نظر تھے

ہر کس کہ شد صاحبِ نظر، دینِ بُزرگاں خوش نکرد!

سرِ دست، یہاں صرف سجاد انصاری اور اُن کی کتاب ''محشرِ خیال'' کا ذکر مقصود ہے ___ متحیر کر دینے والے طرزِ فکر اور مسلّمات شکنی کے باعث اپنے وقت کی یہ شدید نزاعی اور اختلافی کتاب سیّد عامر سہیل کی ''ترتیبِ نو'' کے ساتھ بیکن بکس، ملتان سے ۲۰۰۲ء میں چھپی۔ (صفحات ۲۵۵، قیمت ۱۵۰ روپے)۔

سیّد عامر سہیل نے ''چند ضروری وضاحتیں'' (ص ۷-۱۱) کے تحت کتاب کے تازہ ایڈیشن اور اس کی ''ترتیبِ نو'' کے بارے میں سلیقے کے ساتھ کہنے والی باتیں صراحت کے ساتھ کہہ دی ہیں۔ اُنہوں نے بجا طور پر ''محشرِ خیال'' کی زیرِ نظر اشاعت میں سجاد انصاری کے ایک تحریری اقتباس کے اضافے پر خاموش اظہارِ مسرت کیا ہے۔ یہ واقعی اس ایڈیشن کا ایک امتیاز اور اُن کی ''دل چسپ تلاش'' کا ایک اچھا

انعام ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''زیرِ نظر اشاعت میں ''ایک خط سے اقتباس'' کے عنوان سے سجاد انصاری کی ایک اضافی تحریر شامل کی گئی ہے۔ یہ خط سجاد انصاری نے خواجہ منظور حسین کو لکھا تھا۔ مجھے یہ اقتباس عظمت اللہ خاں کی کتاب ''انتخابِ مضامین عظمت'' سے ملا، جو فٹ نوٹ کی صورت میں درج تھا۔ سجاد انصاری کی تحریر ہونے کے ناطے میں نے اسے کتاب میں شامل کرلیا ہے۔'' (صفحہ ۸)

خوبیٔ قسمت سے سجاد انصاری کا وہ ''اصل قلمی خط'' (۴) جس کا ایک اقتباس فاضل مرتب نے ''محشرِ خیال'' (ص ۳۳-۱۳۲) میں شامل کیا ہے، میرے ذخیرۂ مکاتیب میں محفوظ ہے۔ سجاد انصاری کے خط میں عظمت اللہ خاں کی نثری نگارش ''گڑیا خانہ'' کا ''ذکرِ خیر'' زیرِ بحث آیا ہے۔ اس پر عظمت صاحب نے اپنے ایک مفصّل خط میں (۵) اپنا ردِّ عمل اور نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ خوش قسمتی سے عظمت اللہ خاں کا یہ خط (مکتوبہ ۲۰-فروری ۱۹۲۴ء) بھی میرے ذخیرے میں موجود ہے۔

یہاں سجاد انصاری کا خط مکمّلاً اور عظمت اللہ خاں کے خط کی متعلقہ عبارت کو، اس یقین کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے کہ یہ نوادر، سجاد انصاری اور عظمت اللہ خاں کے مزاج اور ادبی رویوں کو سمجھنے میں معین اور مفید ہوں گے۔ خواجہ منظور حسین کی قلمی تحریری یادداشت کے مطابق جو میری تحویل میں ہے ''علی گڑھ میگزین کی بدولت ۱۹۲۲ء میں (اُن کی) سجاد انصاری سے راہ و رسم پیدا ہوئی۔ اُن کی کم و بیش تمام تحریریں اسی رسالے میں چھپیں۔ ان کے علاوہ اپنے ''بے محابا'' تاثرات وہ خطوں میں بھی برابر ظاہر کرتے رہے۔ جب اُن کے مجموعۂ نظم و نثر ''محشرِ خیال'' کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو وہ سارے خط میں نے اُن کے ناشر الیاس مجیبی صاحب کے حوالے کردیئے۔ اُن سے وہ اثنائے سفر میں گم ہوگئے۔ یہ ایک خط میرے پاس بچ رہا۔

سجاد انصاری کا خط، بنام: خواجہ منظور حسین (علیگ):

بارہ بنکی، ۱۳-دسمبر (۱۹۲۳ء)

مکرمی، تسلیم

☆(۶) آج کل اچھا ہوں ___ آپ ہی آپ کچھ لکھنے کا جی چاہا۔ نتیجہ آپ تک پہنچتا ہے۔ اس کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کیا لکھوں۔ اسے دیکھ کر آپ متعجب بھی ہوں گے اور شاید مسرور بھی۔ ایک مخصوص حیثیت سے اور ایک حد تک یہ مرے ''مرکزی'' خیالات ہیں، محض وقتی اور تفریحی نہیں۔ ☆☆ ایک مضمون اور ہے وہ اس کے بعد بھیجوں گا۔ یہ غیر معمولی مستعدی صرف اس لیے ہے کہ خیالات

اتنے دنوں تک خاموش رہے، اب اُبھرنا چاہتے ہیں۔ اُس مضمون کا موضوع چاہے سن لیجیے: ''بیوی'' (۷)

رشید صاحب (۸) کے ''فلسفۂ ازدواج'' (۹) کو پڑھ کر گدگدی سی محسوس ہوئی۔ یہ مضمون اس کا نتیجہ ہے یعنی۔۔۔ کاہے محابا تبسّم (۱۰)۔

رشید صاحب (کی تعریف) کرنی اُن کی اہانت کرنی ہے۔ میں ابتدا سے اُن کا معترف ہوں، بالخصوص اُس ظرافت کا جو انتہائی بے نیازی کے ساتھ خیال پر حاوی ہوجاتی ہے۔ وہ ایک مخصوص انداز (کے) مالک ہیں۔ بلند خیالی کے ساتھ ظرافت کی لطافتیں مل کر الفاظ اور جملوں کو ایک پُر شباب عورت سے زیادہ دل آویز (بنا) دیتی ہیں۔

آپ کے عظمت اللہ سے مجھے بُغضِ للّٰہی ہوتا جاتا ہے۔ وہ مجھے حسن نظامی (۱۱) کے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کو یہ شوق ہے کہ اپنے خیالات کو مہمل بناتے رہتے ہیں، بالخصوص اُن کی ہندی شاعری۔ اُن سے کہیے کہ خیالات بذاتِ خود کوئی چیز نہیں، اگر الفاظ چاہیں تو خیالات کو بلندیوں پر پہنچا دیں اور اگر گرانا چاہیں تو بہتر سے بہتر خیال کو تحت الثریٰ میں ڈال دیں۔

ہندی اور بھاشا کے جذبات اُسی زبان کے متحمل ہوسکتے ہیں جو اُن جذبات کے ساتھ فطرتاً وابستہ ہے۔ کوئی دوسری زبان اُن جذبات سے مانوس ہی نہیں ہوسکتی کوئی سادہ لوح عورت جس کی نشو و نما ہندی تمدن کی فضا میں ہوئی ہو، اگر مجھے باصرار ''بیرن گھر نہ جا'' کہے، مجھ کو اُس کی محبت پر پیار آجائے گا، لیکن اسی جذبے کو اگر ایک تعلیم یافتہ عورت، اِن الفاظ میں ادا کرے: ''اُس مردار گھر کی طرف خبردار قدم نہ رکھنا'' میں اُسے بلا ارادہ مار بیٹھوں۔

اُن حضرات کو سمجھایئے کہ حسن نظامی کی علمی اور ادبی گمراہیوں سے سبق لے کر اپنے ارادوں سے (باز) (۱۲) آئیں ___ مگر مجھے ایک اندیشہ ہے۔ اُن کے مضامین سے معلوم ہوتا (ہے) (۱۳) وہ اچھے خاصے سن آدمی ہیں، یعنی چالیس سال سے زیادہ ___ پھر اصلاح کیسے ہوگی؟

میں نے اُن کی ''گڑیوں'' کو (بغور) (۱۴) دیکھا ___ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سطر مرے غصے کو بڑھاتی گئی۔ جہاں کوئی نااہل، کوئی بڑی بات کہنا چاہتا ہے، اُس کا ہر انداز مضحکہ انگیز (ہو) (۱۵) جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک معمولی موضوع پر اس سنجیدگی کے ساتھ کچھ (لکھنا) (۱۶) ہی حماقت ہے۔

مجھے ایک صاحب یاد آگئے جو ''نہٹو سرکل'' (۱۷) میں رہا کرتے تھے۔ اُن کے انداز کی سنجیدگی کے لحاظ سے لوگوں نے اُن کا نام: "Serious thoughts on Common Subjects" رکھا تھا عظمت اللہ ادبی حیثیت سے بالکل وہی ہیں۔ چند اشعار (۱۸) ہوئے ہیں بھیجے دیتا ہوں۔

آج دنیا میں نہیں محرم شیطاں کوئی — ورنہ ہوتا ہی نہ بیگانۂ یزداں کوئی
عفو کر دے گا وہیں لاکھ جہنم پیدا — کیوں مرے ذوقِ سزا سے ہے پریشاں کوئی
مجھ کو تسلیم فروغِ مہ و انجم لیکن — سامنے میرے نہ آیا شبِ ہجراں کوئی (۱۹)

___ (سجاد)

محمد عظمت اللہ خاں کا خط موسومہ: خواجہ منظور حسین (علیگ):

[حیدرآباد، (دکن)]

۲۰-فروری ۲۴ (۱۹ء)

شفیقی و مکرمی، السلام علیکم

کل آپ کا کارڈ پہنچا۔۔۔ بڑا لطف تو سجاد صاحب کی رائے سے آیا جو اُنہوں نے خاکسار کے متعلق ظاہر کی ہے اور آپ نے ستم ظریفی یہ کی کہ ماجد صاحب (۲۰) کی رائے کے ساتھ ہی ساتھ، اُن کی رائے بھی شائع کی (۲۹)۔

سجاد صاحب کے پہلے کے جملوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ یہ ایک جدید اکتشاف ہے کہ ''خیالات کوئی چیز نہیں'' اس پر ایک پُر لطف مضمون ہوسکتا ہے ___ دوسری بات اور نہایت نفیس بات یہ ہے کہ سجاد صاحب نے انجانے پن میں میرے اُسلوب کی صحیح صحیح تعریف کر دی ہے یعنی: (Serious thoughts on common subject) یہی تعریف سائنٹفک میتھڈ کی ہے۔ میں طبعًا اس کے عکس یعنی: (Light thought on serious subjects) سے بدکتا ہوں کیوں کہ میرا یہ خیال ہے کہ دُنیا میں کوئی uncommon مضمون ہے ہی نہیں۔ بہرحال اس قسم کی فرانک (frank) رائے ہمیشہ مفید ہوتی ہے گو بعض طبائع ایسی بے باکانہ رائے سے بھاگتی ہوں۔

رائے تو خیر بے باکانہ ہونی ہی چاہیے لیکن ہر رائے دینے والے کا اُسلوب فطرتاً جداگانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سجاد صاحب کا اُسلوب بھی رائے کی بے باکی کے مطابق ہے۔ ادب میں ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے تاکہ بعض لکھنے والے جو ایک رُخ ہو جاتے اور اپنے رنگ میں غلو کر جاتے ہیں، اُن کی روک تھام ایسی ہی بے باکانہ رائے سے ہوسکتی ہے ___ جو مضامین میں نے (علی گڑھ) میگزین میں بھیجے، وہ اس میں شک نہیں کہ میری خاص ظرافت کی تھیوری کی انتہائی اُڑان تھی۔

فلسفیانہ مضامین، ظرافت کے پہلو سے لکھے جائیں تو ظاہر ہے کہ ظرافت بیچاری اس قدر سنجیدہ ہو جاتی ہے کہ اس پر seriousness کا اطلاق ہو جاتا ہے مگر یہ بھی ایک کوشش تھی اور خصوصاً کالج کے طلباء کے مدنظر میرا خیال تھا کہ اس طرح لکھنے سے فلسفیانہ مضامین جو خشک اور ڈراؤنے سے ہوتے ہیں ایک حد تک نہایت عام نقطۂ نظر سے اور ظریفانہ رنگ میں لکھے جائیں۔

اب اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس کا اندازہ ہر شخص، اپنے مذاقِ سلیم کے مطابق کرے گا۔ مجھے اب اس سے سروکار نہیں کہ کوئی صاحب کیا خیال فرماتے ہیں۔ ہر شخص کا ذوق جداگانہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ یہی ادبیات کی ترقی کی علامت ہے۔۔۔۔ ہندی الفاظ کے متعلق میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو جو اُردو کا شیدا ہے چاہیے کہ ہندی کے اپنے مذاق کے مطابق شستہ الفاظ زیادہ استعمال کرے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ جہاں ہندی کا لفظ نہ ٹھس سکے، وہاں بھی خواہ مخواہ ٹھونسیے۔

اُردو، فارسی اور عربی کی بھی بے انتہا رہینِ منت ہے۔ لہٰذا اُصول یہ ہونا چاہیے کہ اُردو میں جہاں تک ممکن ہو ہندی کے الفاظ (اگر لکھنے والے کا ذوق پسند کرے) زیادہ برتے جائیں لیکن جہاں فارسی اور عربی کے الفاظ مستحسن معلوم ہوں، وہاں بے تکلف یہ لفظ استعمال کیے جائیں۔ آج کل (۱۹۲۴ء) کا اثر بھی بے انتہا پڑ رہا ہے۔ جہاں انگریزی کا لفظ ہمارے مذاق کے مطابق ٹھیک بیٹھے وہاں، بے تکان انگریزی لفظ سے کام لینا چاہیے۔

بہرحال میرا اُصول یہ نہیں ہے کہ اس زبان کے لفظ نہیں لو اور اس زبان کے لفظ لو ___ میری پالیسی یہ ہے کہ بہ لحاظ بُو باس، اُردو دراصل ہندی ہے۔ لہٰذا پہلے ادبیات میں ہندی الفاظ ___ ٹھیٹ اُردو، مناسب ہوں گے لیکن فارسی اور عربی اور ترکی اور انگریزی کے الفاظ وہاں استعمال ہونے چاہئیں جہاں ادبی ذوق یا خیال کی خاص ضرورت متقاضی ہو۔

ساری زبانوں سے، دنیا بھر کی زبانوں سے اُردو کو متمتع ہونا چاہیے مگر حسب ضرورت ذوق کی رہبری کے لحاظ سے ___ غرض اس مبحث پر ایک طول طویل مضمون کی ضرورت ہے، جو کبھی انشاء اللہ تعالیٰ لکھا جائے گا۔۔۔۔ اب بس، باقی ہوس۔

نیازمند

محمد عظمت اللہ خاں

خواجہ منظور حسین (علیگ) کی ایک قلمی تحریر کے مطابق جو اُنہوں نے مجھے مرحمت فرمائی، عظمت صاحب سے اُن کے ذاتی مراسم ''علی گڑھ میگزین'' کی ایڈیٹری کا انعام تھے۔ خواجہ صاحب نے ایک بار چھٹیوں میں عظمت صاحب سے ملنے کے لیے حیدرآباد دکن کا سفر بھی اختیار کیا ___ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ''ملا تو اُنہیں بڑا تنومند اور زندہ دل پایا اور شعر و ادب سے اُن کی لگن اور تخلیقی اُدھیڑ بن سے متاثر ہوا ___'' اُردو کے علاوہ، خواجہ صاحب کے نام، عظمت اللہ خان کے انگریزی زبان میں لکھے گئے کچھ خط بھی میرے ذخیرۂ نوادر کی زینت ہیں۔

حوالے اور حواشی

۱۔ الیاس احمد مجیبی کے ایک اچھے خاکے کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر اسلم فرخی کا مضمون، مطبوعہ: کتاب نما، نئی دہلی ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۴۳-۶۰۔

۲۔ ''انگارے'' (طبع اوّل ۱۹۳۲ء) مرتبہ: پروفیسر احمد علی (ولادت: دہلی یکم جولائی ۱۹۲۰ء، وفات: کراچی ۱۴-جنوری ۱۹۹۴ء) بھی اپنے عہد کے رواجی ادبی حلقوں کی کتنی ہی ''ناپسندیدہ'' کتاب

رہی ہو، جدید اُردو افسانے کی روایت میں ایک اگلے قدم اور اہم سنگ میل اور موڑ کی حیثیت سے اسے نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگرچہ اس کا حشر بھی ''محشرستانِ خیال'' کا سا ہوا اور یہ قابلِ گرفت ٹھہری۔

۳۔ عبدالرحمٰن بجنوری ناگہاں انفلوینزا کی زد میں آئے۔ سجاد انصاری اور عظمت اللہ خاں تپ دق کا شکار ہوئے جو اُس زمانے میں لاعلاج سا مرض جانا جاتا تھا۔

۴۔ مکتوب سجاد انصاری، مورخہ ۱۳-دسمبر (۱۹۲۳ء)، موسومہ: خواجہ منظور حسین (علیگ)۔

۵۔ محمد عظمت اللہ خاں کا خط، مورخہ ۲۰-دسمبر ۱۹۲۴ء، بنام: خواجہ منظور حسین (علیگ)۔

۶۔ ☆تا☆☆ یہ عبارت سجاد انصاری نے خط کی دائیں جانب حاشیے پر بڑھائی ہے۔

۷۔ ''بیوی'' کے موضوع پر ایک سات سطری شذرہ ''محشرِ خیال'' (ترتیب نو: سیّد عامر سہیل) کے صفحہ ۵۳-۵۲ پر موجود ہے۔ اس موضوع پر رشید احمد صدیقی کا ایک انشائیہ ''نقش ہائے رنگ رنگ'' (ملتان ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے۔

۸۔ رشید احمد صدیقی، ولادت: مریاہو، جونپور ۲۴-دسمبر ۱۸۹۲ء، وفات: علی گڑھ ۱۵-جنوری ۱۹۷۷ء۔

۹۔ یہ مضمون علی گڑھ میگزین اکتوبر نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپا لیکن بوجوہ میگزین سے نکال دیا گیا۔

۱۰۔ یہاں سجاد انصاری کے اصل قلمی خط کا ایک لفظ کیڑا چاٹ گیا ہے۔ قیاساً یہ لفظ ''بیوی'' ہونا چاہیے۔

۱۱۔ خواجہ حسن نظامی، ولادت: دہلی ۱۵-دسمبر ۱۸۷۸ء، وفات: ۳۱-جولائی ۱۹۵۵ء۔

۱۲تا۱۶۔ یہاں بریکٹ میں درج لفظوں کو کیڑا چاٹ گیا ہے۔ الفاظ کا یہ اضافہ قیاسی ہے۔

۱۷۔ خواجہ منظور حسین (علیگ) کی نشان دہی کے مطابق علی گڑھ کا ایک ہوسٹل۔

۱۸۔ یہ سطر اور اشعار سجاد انصاری نے خط کی دائیں جانب حاشیے پر سرخ روشنائی سے بڑھائے ہیں۔

۱۹۔ یہ تینوں اشعار ''محشرِ خیال'' کی زیرِ نظر اشاعت میں شامل ہیں، دیکھیے: صفحہ ۲۵۰۔

۲۰۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، ولادت: دریاباد مارچ ۱۸۹۲ء، وفات: لکھنؤ ۷-جنوری ۱۹۷۷ء۔

۲۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے پر مشتمل، اُن کا اصل قلمی پوسٹ کارڈ مورخہ ۱۲-نومبر ۱۹۲۳ء میرے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ حسین

رفیق غزنوی ___ منٹو کا ایک کردار

رفیق غزنوی سے ہمارا تعارف منٹو کے تحریر کردہ خاکے سے ہوتا ہے۔ (۱) نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آباو اجداد غزنی کے رہنے والے تھے، وہ خود پشاور میں رہتا تھا، اسے پشتو بولنا آتی تھی، افغانی فارسی بھی جانتا تھا، عام طور پر پنجابی میں گفتگو کرتا، انگریزی اچھی خاصی لکھ لیتا، اُردو میں اگر مضمون نگاری کرتا تو اس کا بڑا نام ہوتا، اسے اُردو ادب سے بڑا شغف تھا اور اس کے پاس اُردو ادب کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے گھر گلشن محل (بمبے) میں اس کے کمرے میں کتابیں بڑی ترتیب سے رکھی رہتیں۔ خیال تو یہی ہوتا کہ وہ محض میراثی ہے، لیکن اس سے گفتگو ہوتی تو اس کے مطالعے اور معلومات کا علم ہوتا۔

رفیق غزنوی کا چہرہ لمبوترا بہت پرکشش تھا، خدوخال تیکھے اور نوکیلے نہیں تھے مگر جاذب نظر تھے، ناک لمبی جو پھننگ کے قریب چوڑی ہوگئی تھی، بہت وجیہہ شکل وصورت تھی۔

برسوں منٹو نے اس کا ذکر سنا، رفیق کی مخصوص طرز میں گائی غزلیں ہر کوٹھے پر گائی جاتی تھیں۔ بحر رفیق کی ہوتی انداز رفیق کا تھا، منٹو سے ملنے تک کے عرصے میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کٹڑ گھنیاں کی قریب قریب تمام مشہور طوائفوں کو سرفراز کر چکا ہے۔

محمود غزنوی اور رفیق غزنوی میں غزنی کے علاوہ ایک مماثلت تو یہ تھی کہ دونوں بت شکن تھے اور دوسری یہ کہ ہندوستان پر محمود کے سترہ حملوں میں سے بارہ بہت مشہور ہیں اور رفیق نے بھی جن طوائفوں کو فیض یاب کیا ان کی تعداد بھی بارہ تک پہنچ سکتی تھی۔

منٹو نے زندگی کے سارے اچھے برے پہلوؤں اور کرداروں کو اپنا موضوع بنایا ہے، لیکن کچھ کردار ایسے ہیں جن کا ذکر وہ اک ادائے خاص کے ساتھ کرتا ہے۔ رفیق غزنوی کا کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے جس کا ذکر کرتے سمے منٹو پر سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بقول عصمت چغتائی ''رفیق غزنوی سے کچھ عجیب قسم کی محبت تھی جو سمجھ میں نہ آئی، جب اس کا ذکر کیا یہی کہا، ''بڑا بدمعاش لفنگا ہے، ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوائی ہو۔'' بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔'' (۲)

جب تک اس سے منٹو کی ملاقات نہ ہوئی وہ اُسے کھوجتا رہا، جب جب منٹو کو اس کا پتہ ملا، وہ اس سے ملاقات کے لئے گیا اور تب تب پریوں کی کہانی کے کسی پراسرار شہزادے کی طرح رفیق غزنوی کسی اور

نئی مہم پر روانہ ہو گیا اور منٹو کی بے چینی کو بڑھاوا دے گیا اور پھر جب رفیق غزنوی اس سے ملا تو بقول منٹو_

''میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لم تڑنگ آدمی عمدہ سلے ہوئے سوٹ میں نمودار ہوا___ یہ رفیق غزنوی تھا۔اس نے کمرے میں اندر داخل ہوتے ہی مجھے موٹی گالی دی اور کہا___ ''تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔''

''اِسی لمحے۔۔۔اِسی ثانیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں رفیق غزنوی کو ازل سے جانتا ہوں۔''

منٹو اس کا خاکہ تحریر کرتا ہے تو وہ اس کی برائیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔منفی انداز میں نہیں بڑے مثبت انداز میں___ اسے اس کی حرکات وسکنات میں عجب قسم کا سطحی لاابالیانہ پن محسوس ہوتا ہے اور اس کا اندازِ تکلم اس کے خوبصورت وجود پر تو بالکل نہیں سجتا، اسے اس کا ہاتھ نچانے کا انداز بھی پسند نہیں آتا، وہ اُسے اول درجے کا کمینہ، خودغرض اور سفلہ کہتا ہے، جس کے لئے اپنی ذات مقدم ہے، جو پرلے درجے کا بے غیرت ہے، کہنے کو تو پٹھان ہے لیکن قطعاً غیور نہیں___ کچھ بھی کہہ لے منٹو___ لیکن اُسے رفیق سے محبت ہے اور اِسی لئے وہ اس کی باتیں کرتا تھکتا نہیں۔وہ سمجھتا ہے کہ رفیق کی رنگارنگ شخصیت کو احاطہ تحریر میں لانا اس کے بس کی بات نہیں کہ ''اس کی ہزار پہلو شخصیت کا احاطہ چند صفحات نہیں کر سکتے'' اور جب وقت ملے گا تو اس پر ایک کتاب تحریر کرے گا۔

منٹو کے تحریر کردہ خاکے کی روشنی میں رفیق غزنوی کی شخصیت اپنے ابنارمل رویے کی بنا پر چونکاتی ہے اور نفسیات کی رو سے اگر دیکھا جائے تو وہ ایک ایسا ابنارمل کردار ہے جس کی بنیادی Morbidity اس کا Hypomania ہے، جبکہ اس کی دوسری ابنارمل خصوصیات اس ہائپومینیا کا ہی حصہ ہیں۔علم نفسیات Hypomania کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ___

Hypomania is a lesser degree of mania, in which abnormalities of mood and behaviour are too persistent and marked to be included under cyclothymia but are not accompanied by hallucinations or delusions. There is a persistent mild elevation of mood (for at least several days on end), increased energy and activity and usually marked feelings of well-being and both physically and mental efficiency. Increased sociability, talkativeness, one familiarity, increased sexual energy, and a

decreased need for sleep are often present but not to the extent that they lead to severe disruption of work or result in social rejection. Irritability, conceit, and boorish behaviour may take the place of the more usual euphoric sociability. (3)

لارڈ بائرن کی طرح زندگی گزارنے والا رفیق غزنوی طوائفوں، گھوڑا ریس اور شراب کا بے انتہا رسیا تھا۔تقسیم ہند سے قبل فلم انڈسٹری کی ہر طوائف کو اس نے اپنے دام میں پھنسانے کی بھرپور کوشش کی۔کسی ایک دن اگر یہ خبر گرم ہوتی کہ رفیق انوری نامی طوائف کو لے اُڑا ہے تو کچھ عرصے کے بعد یہ اطلاع موصول ہوتی کہ وہ اسے واپس کر گیا ہے یہ کہہ کر___ ''لو سنبھال لو اپنی سنڈ کی پُڑی کو''___ پھر معلوم ہوتا کہ وہ اب زہرہ طوائف کے ساتھ رہ رہا ہے جبکہ اس سے پہلے زہرہ کی ماں اور ماں کے بعد زہرہ کی بڑی بہن مشتری سے تعلق رکھ چکا ہے۔زہرہ کے بعد اس کی بہن خورشید عرف شیداں اس کے حرم میں داخل ہوتی ہے اور شیداں کے ساتھ گزر بسر کرتے کرتے وہ کبھی کبھی ان کی موٹی بہن ہیراں کے دل کے ڈاک بنگلے میں بھی مقیم ہو جاتا ہے۔لاہور کے ایک لالہ جی سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو ان کے ساتھ رہنے والی خوبصورت لڑکی زیب النساء سے بھی آنکھیں لڑ جاتی ہیں۔پری چہرہ نسیم کے حسن کی تعریف میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے، اس تک رسائی تو نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جب پری چہرہ نسیم کم عمر تھی تو وہ اس کی والدہ چھمیاں (شمشاد جو اپنے وقت کی دلی کی قیامت خیز طوائف تھی) کے بالا خانہ پر پندرہ روز ''زیرحراست'' رہا تھا۔نور جہاں جسے وہ شراب کے نشے میں جھوم جھوم کر نورِ جہاں، سرورِ جہاں قرار دیتے تعریفوں کے پل باندھتا ہے (اگرچہ یہ پل راستے میں ہی ٹوٹ جاتے ہیں) وہ اس کے ہاتھ صرف اس لئے نہیں لگتی کہ وہ شوکت حسین رضوی کی اسیر تھی، البتہ بمبئی کی رقاصہ ستارہ جسے منٹو نے نیفومینک (Nafomanic) قرار دیا ہے بغیر رفیق کی خواہش اور ارادے کے سرفراز ہو جاتی ہے لیکن صرف ایک رات کے لئے___ یہ بات عجیب بھی تھی اور حیران کن بھی کیونکہ وہ تو جس کو اسیر بناتا اس کے ہاں دس پندرہ روز کا قیام اس کا روزمرہ تھا___ بہرحال بات کچھ بھی ہو اگر ستارہ عام عورتوں سے مختلف تھی تو رفیق بھی کوئی روایتی مرد نہیں تھا۔وہ ایک کے بعد ایک عورت سے تعلق قائم کرتا ہے، ایک کے بعد ایک بہن اس سے فیض پاتی ہے، وہ Taboos کو نہیں مانتا___ دیکھا جائے تو ایک سطح پر یہ اس کی شخصیت کا مضبوط پہلو ہے لیکن دوسری سطح پر یہی اس کی کمزوری ہے۔اس کا یوں بین الشخصی تعلقات میں تبدیلی لانے کا عمل دراصل اس کا Sexual relation disorder ہے۔یہ Disorder اس کی شخصیت کا خاصا ہے، کیونکہ وہ ہر طرح کے روایتی اخلاق سے انحراف کرتا ہے۔وہ تمام مروجہ اصولوں کو توڑتا ہے۔

ہر شخص میں Inhibition behaviour system ہوتا ہے جس کے تحت وہ معاشرے کے خوف میں مبتلا ہو کر اپنی خواہشات کے خلاف مزاحمت کرتا ہے لیکن رفیق میں یہ سسٹم ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو بہت کم، کیونکہ وہ اپنی خواہشات کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتا، وہی کچھ کرتا ہے جو اس کا جی چاہتا ہے۔ وہ ایک ایسا Impulsive کردار ہے جو کسی پابندی کو قبول نہیں کرتا اور جس میں ایک نارمل انسان سے کہیں زیادہ جنسی تعلقات رکھنے کی توانائی موجود ہے۔ وہ نہ صرف شراب کا عادی ہے بلکہ اسے بری عورتوں اور Sex کی بھی Addiction ہے۔ جنس اس کے نزدیک ایسے ہی ہے جیسے کھانا کھانا!! وہ جب کسی شریف عورت کو دیکھتا ہے تو اُسے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اس کی دم صرف طوائفیں ہی ہلا سکتی ہیں۔ کوئی شریف خاتون لاکھ پچکارے چمکارے اس کی دم میں خفیف سی بھی جنبش پیدا نہیں ہوگی، لیکن وہ ان عورتوں سے بھی تعلق قائم کر کے توڑ لیتا ہے۔ ان سے ہونے والی اولاد بھی اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی اس اولاد کے بارے میں کوئی غور و فکر کرتا ہے۔ ہر معاشرے کے Norms کا تقاضا تو کچھ اور ہے لیکن رفیق اپنے رویے میں قطعی اس کے برعکس ہے۔ یہ اس کا Borderline Personality Dicorder ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے موڈ اور ان کے تعلقات ناپائیدار ہوتے ہیں اور عام طور پر ان کا Self image بہت ہی خراب ہوتا ہے۔ (۴)

صرف بری عورتوں سے تعلق قائم کرنے کا عمل ایک سطح پر اسے دہری شخصیت (Ambivalent Personality) بھی بنا دیتا ہے، کیونکہ شعوری سطح پر تو وہ معاشرے کی ہر پابندی کو بے دریغ توڑتا ہے لیکن لاشعوری سطح پر وہ معاشرے کی اخلاقی قیود کو Idealize کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں شاید یہ بات موجود ہے کہ ایسے جنسی تعلقات صرف قابلِ نفرت لوگوں سے ہونے چاہئیں۔ گویا جنس ایک غلیظ رشتہ ہے جو اچھے لوگوں سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ زیب النساء سے اس کا تعلق قائم ہوتا ہے لیکن چونکہ زیب النساء میں روایتی بازاری پن نہیں ہے اس لئے وہ اس سے جلد اکتا جاتا ہے کہ ___ ''بڑی شریف عورت ہے۔۔۔۔ مجھے لطف نہیں آتا۔'' دلی کے ایک معزز ہندو خاندان کی ایک تعلیم یافتہ نوجوان دوشیزہ کو اس سے محبت ہوگئی۔ اسے رفیق نے ایسا دل شکن خط لکھا کہ اس کا عشق ختم ہو گیا کیونکہ اس کا کہنا تھا ___ ''میں کب تک اس کی شریف اور پاکیزہ محبت سے چپکا رہوں گا۔۔۔۔ خدا کے لئے تمام شریف عورتیں اپنے گھر میں رہیں شادی کریں، بچے پیدا کریں اور جائیں جہنم میں، مجھے ان کا عشق درکار نہیں۔ میری ساری عمر گزر گئی کھوٹے سکے چلاتے۔ کھرے مجھ سے نہیں چلیں گے۔'' یوں اس کے وجود کا ایک حصہ سوسائٹی کی اخلاقی قیود کو قبول (Obey) کرتا ہے اور دوسرا انہیں رَد (repel) کرتا ہے یہ اس کی شخصیت کا تضاد (Paradox) بن جاتا ہے۔

وہ طوائف کی صحبت میں لطف پاتا ہے کہ اس نے اُس عورت کو فتح کر لیا ہے جو اس کی طرح گھٹیا بازاری جملے بولتی ہے اور ضلع جگت اور پھبتی بازی میں اس سے دو ہاتھ آگے ہے، لیکن اس فتح مندی کی

سرشاری سے زیادہ وہ اس پابندی سے بچتا ہے جو شریف عورت کے زندگی بھر کے ساتھ میں ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی سہرے جلووں کی بیاہی بیوی شادی کے تین چار سال بعد ہی فوت ہوگئی تھی اور باقی جن عورتوں سے اس کا تعلق رہا تھا انہیں وہ خوبصورت بیٹیوں کی صورت ''سونے کی کانیں'' عطا کر کے رخصت کر دیتا تھا۔ ایسی سونے کی کانیں اس نے نامعلوم کس کس کو عطا کی تھیں خود اسے بھی کچھ یاد نہ تھا ہاں روزِ محشر جب کھدائی ہوگی تو اللہ جو بڑا مردم شمار ہے خود ہی حساب کر لے گا۔ یہ اس کی ذمہ داری نہ تھی۔ اس کا یہ ابنارمل رویہ ایک اعتبار سے پشاور کے روایتی ماحول کے خلاف بھی بغاوت تھی، جہاں عورتوں کے معاملے میں پردے اور دوسری باتوں کا بڑا اہتمام رہتا ہے۔ اِسی لئے منٹو اسے پٹھان تو مانتا ہے لیکن ایسا پٹھان ___ جسے غیرت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ روایتوں سے بغاوت اور پابندیوں کی توڑ پھوڑ اُسے جو لطف دیتی ہے اس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب وہ رشتوں کو بھی Violate کرتا ہے۔ سہرے جلووں کی بیاہی بیوی کے بطن سے اس کی ایک بیٹی ظاہرہ تھی جس نے ضیا سرحدی سے شادی کی اور پھر طلاق لے کر باپ کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ اُسے مشورہ دیتا ہے ___ ''دیکھ پتر، تو نذیر لدھیانوی سے شادی نہیں کرنا چاہتی نہ کر ___ ضیا سرحدی سے کر ___ تذبذب میں ہے تو دونوں سے کر لے۔ اگر یہ تمہیں دھوکا دے گئے تو کوئی فکر نہ کرنا۔۔۔ میں تیرا سب سے بڑا خاوند ہوں ___ تیرا باپ۔'' انوری طوائف سے اس کی بیٹی زرینہ المعروف نسرین تھی۔ اس سے ملا اور پھر منٹو سے کہا ___ ''منٹو ___ سروقد، بے حد خوبصورت، جوانی سے بھرپور، میں نے جب اسے اپنے بازوؤں میں بھینچا تو خدا کی قسم مزہ آ گیا۔'' یہ اس کی Incestous desires ہیں جن کا اس کے جسم سے کوئی تعلق نہیں، لیکن بس اسے رشتوں کو Violate کرنے میں مزہ آتا ہے اور پھر وہ شرمندہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے اس کی بیٹی کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اسے بھی اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس کا Impulse Control Disorder ہے کیونکہ

> "Impulse control disorders are characterized by the failure to resist an impulse, drive, or temptation to perform some act that is harmful to the patient or others". (5)

اس کے ہاں Histronic Personality Disorder بھی پایا جاتا ہے۔ علم نفسیات Histronic personality disorder کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ ___

"Histronic personality disorder characterized by:

(a) Self-dramatization, theatricality, exaggerated expression of emotions;

(b) Suggestibility, easily influenced by others or by circumstances;

(c) Shallow and labile affectivity;

(d) Continual seeking for excitement, appreciation by others, and activities in which the patient is the centre of attention;

(e) Inappropriate seductiveness in appearance or behaviour;

(f) Over-concern with physical attractiveness.

Associated features may include egocentricity, self-indulgenece, continuous longing for appreciation, feelings that are easily hurt and persistent manipulative behaviour to achieve own needs." (6)

رفیق دوسروں کی توجہ پانے کے لئے ہمیشہ غیر معمولی رویہ اپناتا ہے۔ جب اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی تو وہ شاندار لباس پہنتا ہے اور جب پیسا آجاتا ہے تو پھر عام سے کپڑوں میں بھی اُسے پرواہ نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں کڑکی کے دنوں میں اُسے خود پر اعتبار نہیں رہتا اس لئے ایسا ابنارمل رویہ اپناتا ہے اور جب جیب بھر جاتی ہے تو اس کا اندرون بھی اعتبار سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح محفل میں بیٹھے کوئی بات کرتا ہے تو خود ہی ہنستا ہے، بے تحاشا ___ اور پھر خود ہی داد دیتا ہے ___ اپنے آپ کو ___ گانا گانے لگتا ہے تو ''گانا سنانے سے پہلے ہی وجد میں لے آئے گا۔ باجے کے کسی سر پر انگلی رکھے گا اور خود پر سرتاپا رقت طاری کر کے کہے گا، ''ہائے'' یہ ہائے بہت لمبی ہوگی، پھر وہ دوسرے سر کو دبائے گا اور اس سے بھی لمبی ''ہائے'' اس کے حلق سے نکلے گی جو سامعین کے رونگٹے کھڑے کر دے گی۔۔۔ قریب ہوگا کہ سننے والے اپنے کپڑے پھاڑنے اور سر کے بال نوچنے لگیں کہ ایک دم وہ بے تحاشا ہنسنا شروع کر دے گا اور باقاعدہ گانے لگے گا۔'' وہ گویا کم اور مداری زیادہ ہے۔ جس کے نزدیک زندگی بھی ایک طوائف ہے اور وہ اس سے طوائفوں والا ہی سلوک کرتا ہے۔ اسے اپنے بچوں کی تعداد یاد نہیں کہ خدا خود شمار کرے گا اور جب اس کا شیدا اں طوائف سے بیٹا مرجاتا ہے تو وہ منٹو کو اس وقت حیران کر دیتا ہے جب منٹو اسے قراقلی ٹوپی میں غم زدہ دیکھتا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب وہ منٹو کے ساتھ برآمدے میں جاتا ہے تو ___ ''رفیق نے قراقلی اُتار کر زور سے ایک طرف پھینکی اور سگریٹ سلگا کر کہا، ''دُر فٹے منہ۔۔۔ غم کرتے کرتے چہرہ لبوترا ہو گیا ہے۔'' اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔'' یہ احساسات کی کمی اس کی Apathy ہے، رشتوں کا Disorder ہے۔ بقول منٹو وہ ''بے حیائی اور ڈھٹائی کی حد تک ہر وقت خوش رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تندرست ہے۔ اتنی عمر ہونے پر بھی آپ اسے معمر نہیں کہہ سکتے۔'' وہ ہر حال میں خوش رہنے والا انسان ہے، جسے موت بھی افسردہ نہیں کر سکتی۔ اس کا موڈ ہمیشہ Elevated رہتا ہے اور اسی لئے وہ Increased Sexual Energy کا حامل ہے۔ ہر وقت اور ہر اعتبار سے

فعال صورت میں رہتا ہے۔

وہ کسی بھی رنگ میں، کسی بھی صورت حال میں کبھی Depress نہیں ہوتا ہے۔ ایک سطح پر وہ ایک Over active کردار ہے، کیونکہ عام نارمل آدمی کبھی نہ کبھی تو پریشان اور اُداس ہو جاتا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے ساتھ رات کو سوتا ہے، صبح اس سے پھکڑ بازی کرتا ہے، قہقہہ لگاتا ہے اور یوں زندگی کا ایک دن ختم ہو جاتا ہے ایسے ہی جیسے اس کے تعلقات بازاری عورتوں سے ختم ہو جاتے ہیں۔ اُسے کسی کے جانے کا کوئی دُکھ نہیں ہوتا۔ وہ بنیادی طور پر تخلیق کار ہے۔ دھنیں تخلیق کرتا ہے۔ تخلیقیت کے ساتھ عموماً تشویش ہوتی ہے لیکن اس کے ہاں فن کاروں سے مخصوص تشویش مفقود ہے۔ فن کار عالم تشویش میں شاہ کار تخلیق کر جاتے ہیں ___ جبکہ وہ ___ وہ قہقہے لگاتا ہے، پھکڑ بازی اور گالی گلوچ کرتا ہے ___ پھر اسی ساری ہڑبونگ میں کبھی طبلہ صحیح کراتا ہے کہ دائیں طرف مکھی بیٹھ گئی تھی اور کبھی پورے آرکسٹرا میں ایک واکمن آؤٹ آف ٹیون ہو کر اس کی توجہ کو تھام لیتی ہے۔ اس کی بنائی دھنیں، اس کی گائی غزلیں اور گیت صرف مقبول نہیں ___ بہت مقبول ہیں اور وہ کسی تخلیقی Depression کا شکار بھی نہیں ___! حیرت انگیز لیکن ابنارمل!!

رفیق غزنوی منٹو کا ہم زاد ہے ___ ''اسی لمحے۔۔۔ اسی ثانیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں رفیق غزنوی کو ازل سے جانتا ہوں۔'' ___ یہ ایسا ہم زاد ہے جو وہ سب کچھ کرتا ہے جو خود منٹو نہیں کر سکا یا نہیں کر سکتا البتہ ایسا کرنے کی حسرت رکھتا ہے۔ اس بات کو ہم یوں سمجھتے ہیں کہ جے۔ ایم۔ کوئٹزی ڈینیئل ڈیفو کے ناول روبنسن کروسو کے حوالے سے اپنے نوبل لیکچر میں اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ یہ روبنسن کروسو کا ہم زاد ہے جو لندن میں رونما ہونے والے تمام اہم واقعات کی رپورٹیں تحریر کرتا ہے وگرنہ ___

"His own skill, learned in the counting house, was in making tallies and accounts, not in turning phrases, "Death himslef on his pale horse': Those are words he would not think of. Only when he yields him self up to this man of his do such words come." (7)

منٹو نے رفیق کا خاکہ بڑی گہری Involvement کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اسے اپنے اس کردار سے محبت ہے وہ اسے Idealize کرتا ہے۔ وہ رفیق غزنوی کی شخصیت کے سارے پیچ وخم، اس کے دل کے سارے بھید، اس کے باطن کی ساری خباثتوں، نزاکتوں سے واقف ہے۔ وہ کسی ماہر نفسیات سے بھی زیادہ گہری بصیرت کے ساتھ رفیق کا مطالعہ کرتا ہے۔

منٹو نے رفیق سے محبت میں خود کو بری طرح بے نقاب کیا ہے۔ وہ اپنے اس ہم زاد سے ان دنوں متعارف ہوتا ہے جب وہ خود زندگی سے بے راز تھا۔ طبیعت ہر وقت اُچاٹ اُچاٹ سی رہتی تھی۔

تکیوں میں جاتا، قبرستانوں میں گھومتا، کسی اچھی سی لڑکی سے عشق لڑانے کے خواب دیکھتا، دوستوں کے ساتھ مل کر چرس پیتا، کوکین کھاتا، شراب پیتا لیکن جی کی بے کلی دور نہ ہوتی اور اس شدید آوارگی کے دور میں رفیق غزنوی سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ بقول منٹو ___ ''میں نے تکیوں میں، شراب خانوں میں اور رنڈیوں کے کوٹھوں پر جا جا کر پوچھا کہ رفیق غزنوی کہاں ہے؟'' منٹو کو بارہا یہ بھی بتایا گیا کہ اس کی شکل رفیق سے بہت ملتی ہے اور بارہا منٹو نے اس کی وجاہت کو سراہا ___ (یہ منٹو کی انانیت پسند شخصیت کی تشفی تھی)۔ عام طور پر منٹو کے ناقدین کسی تمہید، کسی انجام، کسی واقعے یا کسی ایک جملے سے اس کے فن میں انسان دوستی کے عناصر تلاش کر لیتے ہیں کہ وہ اس بات پر توجہ دیتا ہے کہ ''دیکھو اس شعلۂ روزگار، اس اوباش، اس نکھٹو اور بھڑوے کو، یہ تجارتی کلچر کے کوٹھو میں پھنس کر بھی انسان ہے، اس میں نیکی کا جوہر ___ ہمدردی اور قربانی کا جذبہ زندہ ہے۔'' (۸) لیکن جب وہ رفیق کو زیر بحث لاتا ہے تو وہ ایسا کوئی تاثر نہیں دیتا۔ اس کے لئے کوئی چونکا دینے والا جملہ یا اختتام ترتیب نہیں دیتا۔ یہ تو عصمت چغتائی ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ ___ ''رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے ساتوں عیب کرنے کے، رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔'' (۹)

منٹو کو یہ کردار اس لئے Fascinate کرتا ہے کہ وہ زندگی کو اس طرح بسر کرتا ہے، جیسا کرنے کی شاید منٹو کو حسرت تھی، مثلاً منٹو تمام عمر ایک عورت اپنی بیوی سے وابستہ رہا، اس کو نواب کاشمیری سے کیا تمام ایسے کشمیریوں سے نفرت رہی جو اپنی بیویوں سے برا سلوک کریں۔ (۱۰) عصمت چغتائی پہلی بار منٹو سے ملتی ہیں تو دورانِ گفتگو ذکر صفیہ ہی کا رہتا ہے۔ بڑے پیار بھرے، بڑے میٹھے انداز میں ___ ''منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا، صفیہ بڑی اچھی لڑکی ہے، صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے، آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔'' (۱۱) منٹو کا بیٹا ڈیڑھ سال کی عمر میں فوت ہو گیا ___ ''ہاں، مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔۔۔۔ خدا کی قسم اتنا سا پیروں پیروں چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا، گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی درزوں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا۔'' عام باپوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔'' (۱۲) اسے اپنے بیٹے سے عشق تھا۔ اپنی بیوی اور تینوں بیٹیوں سے بھی بڑا پیار تھا گھر میں وہ صرف ایک خاوند ایک باپ تھا۔ ہاں شادی سے پہلے وہ بھی رنڈیوں کے کوٹھوں پر آتا جاتا رہا ___ رفیق کی طرح اس نے وہاں راتیں بھی گزاریں لیکن شادی کے بعد بڑی چخ چخ کے بعد اسے عصمت چغتائی کو یقین دلانا پڑا کہ وہ بھی کبھی رنڈی باز رہا ہے۔

منٹو نے رفیق غزنوی کا کردار لاشعوری طور پر منتخب کیا ہے کیونکہ منٹو میں رفیق کے برعکس Social Inhibition موجود ہے، وہ اس کی طرح Impulsive بھی نہیں اور اس میں تخلیق کاروں کی مخصوص تخلیقی تشویش بھی ہے۔ منٹو ایک نارمل اور عام انسان ہے جو معاشرے کے Taboos سے بھی

واقف ہے لیکن وہ منافق ہے۔ ''مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں۔ اس لئے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں۔'' (۱۳) جبکہ رفیق کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ اپنے اندر کی کمینگی اور سفلہ پن منٹو کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ رفیق جیسے کرداروں کو نمایاں حیثیت میں پیش کرے۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ شدید خواہش موجود ہے کہ وہ بھی رفیق غزنوی جیسا بنے کیونکہ ایک وقت تھا جب وہ اپنی بیوی اور بچیوں کے لئے یوں پریشان تھا ___ ''میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے۔ دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کماتا ہوں جو میری روزمرہ کی ضروریات کے لئے پورا ہو سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی اور تین کم سن بچیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔'' (۱۴)

اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ اپنی زندگی کے آخری تین چار سالوں میں اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو جیتے جی اللہ کے سپرد کر دیا۔ ایسے جیسے اُسے ان سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اب اس کا جینا صرف اپنے لئے رہ گیا تھا یہ اس کی بے حسی اور خود فراموشی کی انتہا تھی۔ (۱۵)

گویا منٹو کا رویہ اپنی زندگی کے آخری تین چار سالوں میں ہی سہی ___ کسی حد تک ہی سہی کسی بھی سبب ___ بالآخر رفیق غزنوی اپنے ہم زاد سا ہو گیا اور وہ جو Social Inhibition تھا ___ اور جو اسے ہر وقت ڈر رہتا تھا کہ اس کی کمزوریاں دوسروں کے دل میں نفرت کا سبب نہ بنیں وہ خوف ختم ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ وہ Taboos سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت حسن منٹو، ''رفیق غزنوی'' (خاکہ)، لاؤڈ سپیکر، لاہور، مکتبہ اُردو ادب، ۱۹۸۴، رفیق غزنوی کے بارے میں درج شدہ تمام معلومات منٹو کے خاکے سے لی گئی ہیں۔ تقسیم کے بعد رفیق غزنوی کراچی میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ آخری عمر میں فالج ہو گیا تھا۔

۲۔ عصمت چغتائی، ''میرا دوست میرا دشمن'' (خاکہ) مشمولہ نقوش منٹو نمبر شمارہ ۴۹-۵۰، لاہور، ادارہ فروغ اُردو، ص ۳۳۱، ۳۳۲۔

3. "The ICD-10, Classification of Mental and Behavioural Disorders"1992. World Health Organization. Geneva, P.13.

4. Barlow, David. H., Durand. V. Mark, 2001, "Abnormal Psychology". 2nd Edition Wardsworth, U.S.A, P.392.

5. Sadock, Benjamin. J., Sadock, Virginia (Editors) 2000, "Comprehensive Text Book of Psychiatry", 7th Edition, Lippincott Williams & Wilkins, New York, P.1701/

6. "The ICD-10 Classification of Mental and Behavioural Disorders". P.205.

7. Coetzee, J.M., "He and his man", Nobel Lecture, Sweedish (Coetzee - Lecture - S. html) The Nobel Foundation. 2003.

۸۔ ممتاز حسین ''سعادت حسن منٹو کی یاد میں''، (مضمون) مشمولہ نقوش، منٹو نمبر شمارہ ۴۹-۵۰، ص ۳۲۳۔

۹۔ عصمت چغتائی، ''میرا دوست میرا دشمن''، (خاکہ) مشمولہ نقوش منٹو نمبر، ص ۳۳۲۔

۱۰۔ سعادت حسن منٹو، ''نواب کاشمیری'' (خاکہ) لاؤڈ سپیکر مشمولہ منٹو نما، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱، ص ۲۸۱۔

۱۱۔ عصمت چغتائی ''میرا دوست میرا دشمن'' خاکہ نقوش منٹو نمبر، ص ۳۲۸۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط'' مشمولہ نقوش منٹو نمبر، ص ۴۰۳۔

۱۴۔ سعادت حسن منٹو، ''حبیب کا کفن'' یزید (مجموعہ)، دہلی، ساقی بک ڈپو، ۱۹۸۲، ص ۱۸۰۔

۱۵۔ جگدیش چندر ودھاون، ''منٹو نامہ''، لاہور، مکتبہ شعر و ادب، س۔ن، ص ۱۲۴۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات (۷)

ادب اور معروضی حقیقت

یار علی پور مقدم/ رشید قیصرانی

دہ سوختہ

(ایرانی کہانی کا اُردو روپ)

سچ ہے ''نہ اونٹنی کے دودھ کی ضرورت پڑے اور نہ ہی کسی عرب کا منہ دیکھنا پڑے۔'' اب میں سفید داڑھی کے ساتھ کہتا ہوں ''شہد کی بوتل بچہ کے ہاتھ دے دی تا کہ وہ اسے گرا کر توڑ ڈالے۔'' تجھے اپنی تہرانی بیوی کے سامنے بھی شرم نہ آئی اور تو نے کہا ''اسے جو چیز بھی ملتی ہے پیٹ کے جہنم میں ٹھونس لیتا ہے۔'' اچھا ہوا ریا کاری کا یہ ڈھول پھٹ پڑا۔ خدا شاہد و واحد ہے، یہ بات تو نے اس وقت نہیں کی؟ یہ سفر مرا آخری سفر ہے میں اگر دوبارہ تہران میں قدم بھی رکھوں تو اڈے پر تارپین بیچتے پھرنے والوں سے بھی گھٹیا ہوں گا یعنی اب پھر مجھے Prostate کا مرض نہیں ہوگا۔ کار میں بیٹھوں، نہ ایک گھنٹہ، نہ دو گھنٹے، نہ تین گھنٹے، سترہ گھنٹے کا سفر کوئی مذاق ہے۔ خدا قسم، محمد جس کا ایک بندہ ہے اگر میرے بدن میں یہ بیماری ظاہر نہ ہوتی اور اس کا علاج نہ کرانا ہوتا تو میں تہران کبھی نہ آتا۔ افسوس آدمی خود کو خواہ مخواہ بے عزت کرتا ہے۔ یہ تمہاری ماں نے مجھے مجبور کیا۔ میرے سر ہو گئی اور کہنے لگی ''ہائے بدبختی، جاؤ بلکہ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔'' اب چھٹا دن ہے اور میں پایہ تخت تہران کا قیدی ہوں۔ مجھے مہربان ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس بیماری کے علاج کا خرچ بھی میرے پلے ہی سے ہے۔ میں نے جو رقم کفن دفن کے لیے جمع کر رکھی تھی وہ علاج پر اُٹھ گئی۔ میں اپنے باپ کا نطفہ نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نماز کے ساتھ یہ بھی فرماتا ہے ''اے بندگان خدا، والدین کی فرماں برداری میری ہی اطاعت ہے'' اگر سچ تیرے منہ سے نکلے تو کیا وہ شیشی تمہارے سامنے نہیں تھی اور کس طرح تم میرے سامنے بیٹھے اس میں سے کھا رہے تھے؟ خدا کی قسم اگر میں اُٹھ کر اسے تمہارے سامنے سے اُٹھا لیتا اور پھر جب تک میرے ہاتھوں میں سکت ہوتی؟ لعنت بھیجتا ہوں۔ اس وقت تو کہتا کہ میں بیٹو ہوں۔ اللہ نے کرم کیا۔ جب میرا ختنہ ہوا تو باپ مر گیا اور جس وقت سات سال کی عمر میں میرے دودھ کے دانت گرے تو ماں نہ رہی۔ اسی دن سے میں نے ہر کام کیا۔ تیس دن کی مزدوری تین ریال، ایک اندھے بھکاری کی لاٹھی تھام کر اسے بھیک کے لیے گھمانے پھرانے کے عوض ملتی تھی ایک مدت تک ایک بغدادی عرب کے گھر میں نوکری کی اور جس سال خالی ہاتھ ننگے پاؤں ''دہ سوختہ'' سے نکلا تو یہ انیس سو چالیس تھا۔ انیس سو چالیس عیسوی نہ کہ ہجری۔ رات کے وقت ''مسجد سلیمان'' پہنچا۔ اس سے پوچھ، اس سے پوچھ تب جا کر رمضان کا گھر ڈھونڈا۔ اس وقت اس کا گھر اسی دس فٹی گلی میں تھا اور اس نے حال ہی میں آمنہ سے شادی کی تھی وہ صبح سویرے ''درخزینہ'' جاتا اور گاڑی پر پائپ کر رات کو لوٹتا۔ جب آمنہ نے چائے کی پہلی پیالی میرے سامنے رکھی تو رمضان نے کہا

''فلانے آئے ہو کام کرنے؟ آئے ہو تو کیا کرو گے؟'' میں نے کہا ''خدا قسم میں کام کرنے آیا ہوں جب آیا ہوں تو اور کیا کروں'' اس نے کہا صبح سویرے ''فائر سٹیشن'' چلے جانا۔ وہاں ایک ''مسٹر مکنس'' ہیں جسے ایک بوائلر اٹینڈینٹ کی ضرورت ہے۔ اسی صبح سویرے سویرے ''باشگاہ ایران'' گیا۔ میرے ایک پاؤں میں بوٹ اور دوسرے میں جوتی تھی جس میں سے میری پانچوں انگلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ سات بجے یا اے خدا آٹھ بجے میں نے دیکھا کہ مسٹر مکنس کار میں آ رہا ہے اور وہ اندر چلا گیا۔ زیادہ دیر نہ گزری اس نے اپنا شوفر بھیجا کہ جاؤ دروازے پر جو آدمی کھڑا ہے اس سے پوچھو کہ کام کرنے آیا ہے میں نے کہا ''ہاں واللہ بیکار ہوں'' اس نے کہا اس سے پوچھو کہ اصفہانی ہے یا بختیاری؟ اگر وہ کہے اصفہانی تو No کہنا۔ اس کے لیے کام نہیں ہے۔ میں نے کہا ''واللہ میں بختیاری ہوں'' وہ مجھے مسٹر مکنس کے سامنے پاس لے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہنسنے لگا۔ پھر کہا ''کس طائفے سے ہو؟'' میں نے کہا ''میرا طائفہ کرتلائی ہے صاحب۔'' کہنے لگے ''دہ سوختہ'' کے رہنے والے ہو۔'' میں نے کہا ''اے بارک اللہ آپ تو میرے علاقے سے کس قدر واقف ہیں۔'' پھر کہا ''اب تک کسی تیل کمپنی میں کام کیا ہے؟'' میں نے کہا ''صاحب! دو سال آبادان میں۔'' اس نے پوچھا "Certificate"؟ گزشتہ ملازمت کا کاغذ میری جیب میں تھا اور مجھے علم تھا کہ ملازمت سے نکالے جانے کی وجہ غیر مناسب غیر حاضری تھی میں نے دل میں سوچا دیکھا جائے گا۔ جب اس نے کاغذ دیکھا تو کہا ہائے، ہائے، ہائے، ہائے تم نے آبادان میں کاہلی کی۔ میں نے کہا ''واللہ صاحب جب میرا بھائی فوت ہوا تو میں کچھ دن کے لیے دہ سوختہ گیا، کفن دفن میں کچھ دن لگ گئے جب لوٹا تو انہوں نے مجھے ملازمت سے نکال دیا۔'' روزانہ سترہ ریال، ایک پیکٹ کریانہ، ماہانہ بیس کلو آٹا، ایک کیلو چینی اور ایک پیکٹ نیزہ مارکہ چائے پر میں نے کام شروع کر دیا میں نے اس قدر سختیاں برداشت کی ہیں کہ شمر بھی کہے بس۔ دنیا میں جتنے بھی عذاب ہیں وہ میں نے جھیلے ہیں اے خدا تو گواہ ہے میں گزشتہ رات تو مر ہی گیا تھا۔ میں نے اس قدر اپنے آپ کو کھجلایا اس قدر کھجلایا چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتا رہا، پیچ و تاب کھاتا رہا۔ میں اس وقت بھی بیدار تھا جب تم نیکر پہنے فرج کے پاس گئے یعنی پہلے ٹوائیلٹ گئے اور پھر وہاں سے لوٹ کر فرج میں سے گلابی سیب اُٹھایا۔ رعنا تمہارے بعد آئی اور ٹوائیلٹ گئی۔ اگر گزشتہ رات سمندر میں مچھلی نے نیند کی ہو تو میں بھی سویا ہوں۔ میرے دل میں کس قدر دکھ ہیں۔ میں کس قدر بدبخت ہوں۔ کموڈ پر بیٹھتا ہوں تو اُٹھ نہیں سکتا مجھے دیوار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میری ہڈیاں گوشت سے بالکل خالی ہو چکی ہیں۔ جب میں بیٹھتا ہوں تو میرے زانوؤں سے ''رچ رچ رچ'' کی آواز آتی ہے اس وقت تجھے رعنا کے سامنے شرم نہیں آتی جب تو کہتا ہے ''اسے جو چیز بھی ملتی ہے پیٹ کے جہنم میں ٹھونس لیتا ہے'' میرا پیٹ ایک روٹی کا رجا ہوا ہوتا ہے تو دوسری روٹی کے لیے بھوکا ہوتا ہے۔ جب ماں نے مجھے جنا تو اس کا دودھ نہیں تھا۔ ایک عورت نے اپنا پستان میرے منہ میں ڈالا دودھ پلایا خدا اس کو اجر دے۔ جنگ عظیم کے دوران اسی ''اہواز'' میں مجھے ٹائیفس ہو گیا۔ میں قریب المرگ تھا ایک میلا کچیلا

پرانا فوجی اوور کوٹ پہنے اہواز کے پل پر بیٹھا تھا تو ایک راہگیر نے مجھے ایک سکہ دیا جو میں نے لے لیا لیکن صرف وہی ایک مرتبہ پھر میں نے کسی سے کوئی سکہ اس طرح قبول نہ کیا میں نے اس قدر مسور کی دال کھائی ہے کہ ہمیشہ میرے ہاتھ پاؤں پھولے رہتے ہیں۔ صبح سے شام تک پیٹ سے جنگ رہتی ہے۔ میں ساری عمر کبھی کلب نہیں گیا، نہ تنبولہ کھیلا، نہ گھڑ دوڑ اور نہ ہی ہیر۔ اے اللہ تیری معرفت پر قربان جاؤں میں اس زمانے کا آدمی ہوں جب تین کونوں والی بوتل دو ریال میں ایک درجن ملتی تھی اور اس پر ایک ملاح کی تصویر کندہ ہوتی تھی۔ وہسکی، برانڈی، کینیاک لیکن تیرے پاس جو شراب ہے وہ تو کتے بھی نہ پئیں۔ ان دنوں سے کلب کے کبابوں کی حسرت میرے دل میں اب تک باقی ہے۔ میں نے ان سب چیزوں سے پرہیز کی اچھی بری سب چیزوں سے صرف تمہارے لیے۔ میں کہتا ہوں کہ شاید تمہیں میری حالت پر رحم آجائے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے حالات تاریک ہی ہیں۔ اب میں بیمہ کی رقم بارہ سو تومان کو کیا کروں؟ خود کھاؤں؟ تمہاری ماں کو دوں؟ تمہاری بہن کو دوں؟ کس وجہ سے تم اخراجات کے لیے میری مدد نہیں کرتے؟ آقا صفدر جب سے گیا ہے اور جب بھی ''مسجد سلیمان'' آتا ہے تو ساقی کوثر کی قسم، کبھی کوئی میوہ بھی لایا ہے؟ ایک دفعہ بھی جا کر ایک کیلو گوشت نہیں لے آیا۔ ایک دفعہ بھی ایک کیلو کلیجی گھر نہیں لایا یا جا کر آئس کریم لے آئے یا پھر کبھی کبھار کوئی پھل۔ گھر کے خرچ کے لیے رقم، حرام۔ اس نے اسحاق سے کچھ رقم لینی تھی، اسے کہا کہ جب تمہارے پاس رقم ہو تو ابا جان کو دے دینا۔ ایک دن میں نے دیکھا اسحاق دروازے پر آیا ہے۔ اس نے گھنٹی بجائی میں دیکھنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں اسحاق ہے۔ اس نے کہا ''یہ چھ ہزار تومان ہیں میں نے صفدر کے دینے ہیں۔'' تمہاری ماں سمجھی کہ دھوکہ بازی کرنے آیا ہے۔ صفدر نے فون کیا تو کہا کہ جب تک میں چھٹی پر گھر نہ آؤں اس رقم کو خرچ نہ کرنا۔ میں نے کہا ٹھیک کہتے ہو۔ بہت اچھا۔ جھوٹا خدا کے نزدیک چور ہے۔ پانچ یا چھ سو تومان میں نے لیے، مجھے گمان ہے کہ فون کا بل ادا کیا، دو سو تومان بجلی کے دیئے آٹھ نو سو تومان اس طرح خرچ ہو گئے۔ جب وہ ''بوشہر'' سے آیا تو میں رقم اس کے حوالے کرنے کے لیے اُٹھا لایا اور کہا کہ یہ گھڑی غضنفر ''خاوک'' سے لایا ہے اور میرے پاس سترہ سو تومان نہیں ہیں کہ اسے دوں۔ خدا حاضر ہے۔ میں نے وہ رقم دی اور باقی کا حساب بتایا، نو سو تومان بچ گئے تھے۔ میں نے کہا ''لخت جگر یہ نو سو تومان مجھے دے دو، گوشت روٹی سالن وغیرہ کے لیے۔ تجھے پتہ ہے اس نے کیا کہا؟'' دیوانوں کے طرح وہ رقم جھپٹ لی اور کہا ''باقی تو تم نے لے لی ہے اور اب یہ رقم بھی ہتھیانا چاہتے ہو؟'' میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ''جب بھی چھٹی پر آتے ہو تو صبح سے شام تک تمہارے لیے چائے بنائی جاتی ہے میرے شکر اور چینی کے کوپن تم کھا جاتے ہو، فقط ''ونسٹن'' سگریٹ کا ایک پیکٹ دیتے ہو۔ نہ روٹی کھانے کا خرچ نہ کوئی اور خرچہ۔ بتاؤ آخر یہ رقم کہاں سے آتی ہے؟ تیرے پاس ایک لاکھ دس ہزار تومان تھے، بے انصاف تو نے ان میں سے بیس ہزار تومان مجھے دے دیئے؟ حتیٰ کہ جب واپس جانے لگا تو ماں کے پاس جو سونے کا ایک ہار تھا اس کو لے جا کر ایک لاکھ دس ہزار تومان

میں بیچ ڈالا اور اس کے ڈالر خرید کر ترکی چلا گیا۔ پھر وہاں جا کر خط بھیجنے شروع کر دیئے کہ مکان کی رجسٹری اور اشٹام بھیجو ان کا ترجمہ کرانا ہے۔ رہائش کا سرٹیفکیٹ اور میونسپلٹی کا تصدیق نامہ بھیجو اور یہ اور یہ اور یہ۔ میں اگر مرد ہوتا تو صفدر کے اس جال میں نہ پھنستا جب وہ چلا گیا تھا تو قصہ ختم اور پھر تمہارا بڑا بھائی ہے سہراب۔ تم میرا حق ادا نہیں کر سکتے۔ خدا تمہیں میرا حق بخشے۔ وہی سہراب جو اَب امریکہ میں ہے۔ میں برف باری اور بارش کے دوران دو مرتبہ اس کے تیل کمپنی کے وظیفے کے لیے تہران آیا۔ اب جب میں اسے لکھتا ہوں کہ گوشت دو سو تومان کیلو ہے تو جواب میں آتا ہے کہ ''میں اور میری بیوی ہر روز ''تین کیلومیٹر'' جاگنگ کرتے ہیں۔'' بیٹے اب بتاؤ کیا ایسا لکھنا اس کے لیے مناسب ہے۔ خدا کی قسم نہ غیرت ہے، نہ علم ہے نہ مستقل مزاجی۔ کس طرح اتنے بھائیوں کی بہن دربدر ہے اور مختار کتے کے بچوں کی خدمت گزار؟ پہلے تو طلاق یعنی کیا؟ جب اس نے کہا ''نہیں'' اور تمہاری بہن کو دھمکی دی کہ تم جو طلاق طلاق کرتی ہو تو بچوں کے ساتھ یا بغیر بچوں کے۔ اگر صنم اور سعید کو لینا چاہتی ہو تو پھر تم ہی جانو تم خود ذمہ دار ہو گی۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ دباؤ میں نہیں آتی تو کہا کہ کم از کم عدالت سے ایک حکم لے لو تا کہ وہ بچوں کا خرچ ادا کرنے کا پابند تو ہو لیکن میری کون سنتا ہے؟ بیگم گئی اور مختار کو شیر بہا بخش دیا۔ بیٹی بچوں کو لے آئی اور استانی کی حقیر تنخواہ سے بچوں کو پالنے لگی۔ جب شوہر نے دیکھا تو اُس نے کہا میں نے ان کی بہن کو طلاق دے دی، شہر بہا بھی ادا نہ کیا، میرے بچوں کو وہ پال رہے ہیں کس طرح میں نے انہیں گدھا بنایا۔ واہ، واہ، واہ۔ خود محبوبہ کا ہاتھ تھاما اسے بیاہ لایا اب خوب مزے کر رہا ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ اس کتے کے بچوں کو پالنا احمق پن ہے تو کیا میں غلط کہتا ہوں؟ پرسوں ظہر کے وقت جب میں کریم کے گھر بیٹھا ہوا تھا اور آئس کریم میرے ہاتھ میں تھی تو صنم پریشان گھبرائی ہوئی آئی اور کہا بابا مجھے تیس تومان دے، تو مجھے تیس تومان دے۔ میں نے کہا لڑکی خیریت ہے کیا ہوا کیا ہے؟ کہنے لگی تو مجھے تیس تومان دے، تو مجھے تیس تومان دے۔ میں نے کہا بتاؤ تو سہی تیس تومان کس لیے دوں؟ تو کہا ''سعید نے اس کے پرس میں جو کچھ تھا اُٹھایا اور اڈے پر چلا گیا تا کہ اہواز جائے۔'' میں نے کہا ''اے لڑکی اب دو گھنٹے گزر چکے ہیں جب تک تم اڈے پر پہنچتی ہو وہ تم سے بھی آگے نکل گیا ہو گا۔'' خدا کارساز ہے اڈے پر ٹکٹ دینے والے نے جب دیکھا کہ محض بچہ ہے اور تنہا اہواز جانے کے لیے ٹکٹ مانگتا ہے تو اسے شک گزرا۔ اس نے اسے پکڑ کر اڈے کی پولیس کے سپرد کر دیا۔ میری بات تو کوئی بھی نہیں سنتا، آخر تو نے دیکھا۔۔۔ خدا اسے بوجھ اُٹھانے میں کامیاب کرے۔ دیکھا ہم باتوں میں لگ گئے اور بی بی سی کا وقت گزر گیا۔

☆☆☆

جاوید اختر بھٹی

ڈاکٹر رانا محمد نصر اللہ احسان الٰہی

ڈاکٹر نصر اللہ احسان الٰہی نہ صرف عربی زبان کے کامیاب استاد تھے بلکہ وہ علوم اسلامیہ وعربیہ کے بلند پایہ محقق بھی تھے۔ وہ شہرت یافتہ مستشرق پروفیسر آربری کے نامور شاگرد اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی تحقیقی روایات کے امین تھے۔ وہ تحریک پاکستان کے زمانے میں سٹی مسلم لیگ سیالکوٹ کے فعال رکن تھے، جب پاکستان قائم ہو گیا اور ہندوستان سے لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کے قافلے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ انہیں مدد وتعاون کی اشد ضرورت تھی۔ اس وقت نوجوان رانا نصر اللہ کبھی مہاجر کیمپ سیالکوٹ اور کبھی والٹن مہاجرین کیمپ نمبر ا میں کمانڈر کے طور پر مہاجرین کی خدمت میں ہمہ تن مصروف نظر آتے تھے۔

ان کے آباؤ اجداد سروہی ریاست میں آباد تھے بعد ازاں ان کے خاندان کے افراد پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں منتقل ہو گئے۔ ڈاکٹر رانا کی ولادت ۹/اگست ۱۹۱۹ء کو لاہور میں ہوئی انہوں نے گجرات کے ایک سکول میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کا تعلق سیالکوٹ کے ایک معزز ومحترم خاندان سے تھا جو اپنی طبعی شرافت اور نجابت کے لیے معروف تھا۔ ان کے دادا مجسٹریٹ تھے اور لوگ انہیں ڈپٹی صاحب کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ان کے والد رانا احسان الٰہی تحصیل دار تھے اور چھوٹے بھائی ہائی کورٹ بہاولپور بنچ میں فاضل جج تھے۔

ڈاکٹر رانا نے ایم۔اے عربی ۱۹۴۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور ایم۔اے اسلامیات ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ پی ایچ ڈی عربی ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اور مقالے کا موضوع تھا "Rhetoric of The Arabs" اس مقالے میں ان کے نگران ڈاکٹر مولوی محمد شفیع تھے۔ دوسری بار عربی میں ہی انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ اس بار ان کے مقالے کا موضوع تھا "Life and Works of Yaqut al-Hamwi" اس مقالے میں ان کے نگران پروفیسر آربری تھے۔

ڈاکٹر رانا کو دس زبانوں پر عبور حاصل تھا، جس میں عربی، اردو، انگریزی، پنجابی، ہندی، فارسی، عبرانی، آرامی، سریانی اور جرمن شامل تھیں۔

انہیں تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں ۲۰-۲۵ ہزار کتب موجود تھیں جن میں قدیم ونایاب کتب اور مخطوطات بھی موجود تھے۔ ۱۹۹۲ء تک یہ کتابیں ان کے گھر میں محفوظ تھیں۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس حالت میں ہیں۔

ابتداء میں ڈاکٹر رانا نے بطور لیکچرار عربی گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں تین سال گزارے اس کے بعد سات سال وہ ملتان بطور لیکچرر اسلامیات گورنمنٹ کالج ملتان (ان دنوں اس کا نام ایمرسن کالج تھا) میں رہے۔ ملتان قیام کے دوران ان کی دوستی علامہ عتیق فکری کے ساتھ ہوئی جو آخر وقت تک قائم رہی، اس کے بعد تین سال میونسپل کالج لاہور کے پرنسپل رہے، پھر وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبۂ عربی پندرہ سال (۷۵-۱۹۶۱ء) رہے۔ وہ معاون مدیر اعلیٰ دائرہ معارف اسلامیہ (اُردو) پنجاب یونیورسٹی بھی رہے۔

انہوں نے یورپ کا سفر (۵۷-۱۹۵۵ء) کیا تو انگلستان، ہالینڈ، مغربی جرمنی، فرانس، سپین اور ترکی گئے۔ مشرق وسطیٰ کی طرف (۷۱-۱۹۷۰ء) گئے تو سعودی عرب، مصر، شام، لبنان، اُردن، عراق اور کویت کی سیر کی۔ ان تمام اسفار میں اُن کے علمی، تحقیقی اور مطالعاتی حوالے قائم رہے۔

ڈاکٹر امین اللہ وثیر لکھتے ہیں: ڈاکٹر رانا ایک معزز استاد، عظیم محقق اور ہمدرد انسان تھے۔ ان سے سینکڑوں طلبہ نے کسب فیض کیا۔ کوئی بھی شخص ان سے جب کبھی بھی علمی وتحقیقی موضوع پر اعانت کا طلب گار ہوا انہوں نے ہر ممکن حد تک اس کی مدد کی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ میں نے ان سے اپنی کسی تدریسی مشکل کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا انشاء اللہ کل صبح بتاؤں گا اور واقعی دوسرے دن صبح وہ گھر سے اس مشکل مسئلے پر مکمل تحقیقی مواد مرتب فرما کر ساتھ لے آئے۔ پنجاب یونیورسٹی میں ان جیسے گہری تحقیقی نظر رکھنے والے دانشور انگلیوں پر شمار کیے جاتے ہیں۔

وہ نمود ونمائش سے دُور رہتے اور سیاسی سطح پر بڑے لوگوں سے تعلقات استوار کرنے کے قائل نہیں تھے۔ انہیں خوشامد اور چاپلوسی سے کوئی مس نہ تھا اور یہی ان کی وہ ''کمزوری'' تھی جس کی بناء پر وہ پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی نظروں سے اوجھل رہے اور اس جامعہ میں وہ مقام حاصل نہ کر پائے جس کے وہ حق دار تھے۔ اس معاملے میں ہماری جامعات کا ریکارڈ عمومی طور پر بھی کچھ زیادہ قابل فخر نہیں ہے اور تعلیم کے ان اونچے ایوانوں میں بعض نہایت معزز ومحترم اساتذہ کے ساتھ عدل وانصاف کے پہلو کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

ڈاکٹر رانا پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں بطور ریڈر تشریف لائے تھے اور ساتھ ہی اُردو دائرہ معارف اسلامیہ میں چیئرمین کے خصوصی معاون بھی تھے نیز شعبہ عربی کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے لیکن یونیورسٹی کی اندرونی سیاست کی ظالمانہ روش اور ذاتی تعلقات کا پہلو ''کمزور'' ہونے کی بناء پر وہ حالات کے تند وتیز دھارے کا مقابلہ نہ کر سکے اور باوجود استحقاق کے انہیں ''پروفیسر'' کے عہدے پر فائز نہ کیا گیا۔ ان کی ترقی کے لیے طرح طرح کی شرائط عائد کی جاتی رہیں۔ کسی عرب ملک میں سال بھر کے قیام کی انوکھی شرط صرف ڈاکٹر رانا محمد نصر اللہ احسان الٰہی کے لیے وضع کی گئی اور پھر اس عجیب وغریب نئی نویلی شرط کی بجا آوری پر بھی ان سے کیا گیا وعدہ کبھی وفا نہ ہو سکا۔

۱۹۷۵ء میں، میں Rotation کی بناء پر صدر شعبہ عربی تھا۔ ان دنوں آناً فاناً ایک قانون

کے ذریعے ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۰ سال سے گھٹا کر ۵۸ سال کر دی گئی اور یونیورسٹی کے بعض دوسرے سینئر اساتذہ کی طرح ڈاکٹر رانا صاحب بھی اس کی زد میں آ گئے۔ میں نے کوشش کی کہ انہیں توسیعی بنیاد پر یونیورسٹی کی طرف سے شعبہ عربی میں کام کرنے کی اجازت مل جائے، اس وقت کے پرنسپل اورینٹل کالج ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے بھی اس سلسلے میں بڑی تگ ودو کی لیکن جامعاتی سیاست میں ہم سب مات کھا گئے۔ میں نے یہاں تک تجویز کیا کہ ڈاکٹر رانا صاحب کو لیکچر (Basis) پر ہی ہفتے میں دو تین پیریڈ مل جائیں لیکن ہمارے بعض باتدبیر رفقاء کار نے اس کی بھی مخالفت کی اور اس طرح ایک فاضل و محقق ہستی کو جو شعبے کے لیے ہر طرح سے عزت اور نیک نامی کا باعث تھی اورینٹل کالج کی چار دیواری سے دُور رکھا گیا۔

البتہ NesPak اور لندن کے Ency of Seerah کی وساطت سے انہیں ہزاروں روپے کا معاوضہ ہر ماہ باعزت طریقے سے موصول ہوتا رہا۔

ڈاکٹر صاحب ایک بڑے مصنف بھی تھے اور زندگی بھر علمی و تحقیقی میدان میں مصروف کار رہے۔ انگریزی اور عربی دونوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا اور ان دونوں میں ان کی تحریر نہایت خوش خط بھی تھی۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کے لیے کتاب الصید نہ انہوں نے اپنے خوب صورت انداز میں تحریر کی اور وہ اسی صورت میں عکسی طباعت میں چھپی۔ ہجرہ کونسل کے لیے بھی انہوں نے کئی کتابوں کے تراجم کیے۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۱ء کو ڈاکٹر رانا محمد نصر اللہ احسان الٰہی، جنہوں نے تمام عمر ایک عالم، محقق، استاد اور دردمند انسان کے طور پر زندگی بسر کی۔ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے لیکن کوئی عالم مرتا نہیں وہ اپنی کتابوں میں ہمیشہ زندہ رہا ہے۔

ڈاکٹر رانا صاحب کی مطبوعات، تدوین و تحقیق

۱۔ جمہرۃ الانساب از ابن الکلبی حصہ اول، ۶۱-۱۹۵۹ء۔
۲۔ جواہر ایسوف از الکندی جشن الکندی بغداد، ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پیش کی گئی۔
۳۔ مختلف القبایل از محمد ابن حبیب ویسبان (جرمنی) ۱۹۶۴ء۔
۴۔ یاقوت لحموی احوال و آثار (انگریزی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔
۵۔ رسالہ فی اوصاف النساء از فلیمون لاہور، ۱۹۶۸ء۔
۶۔ واحد باری، لاہور، ۱۹۶۸ء۔
۷۔ کتاب الحروف از الرمانی، لاہور، ۱۹۷۲ء۔
۸۔ المتقدب از یاقوت الحموی، لاہور، ۱۹۷۲ء۔
۹۔ کتاب الصیدنہ از البیرونی یونیسکو، ہمدرد کراچی، ۱۹۷۳ء۔
۱۰۔ Catechismus Islamics (اصول الدین) Lahore ۱۹۷۴ء

منتخب مقالات:

۱۔ جلال الدین قزوینی، معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء۔
۲۔ تجزیاتی اشاریہ عجائب الاشعار شیرازی، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ۱۹۵۶ء۔
۳۔ بدیعیات المنار، لاہور، ۱۹۵۱ء۔
۴۔ الکندی احوال و آثار، سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، ۱۹۶۲ء۔
۵۔ منصب قضا مشمولہ نذر رحمان، لاہور، ۱۹۶۵ء۔
۶۔ قرابادین ابن ظہور، ہمدرد صحت کراچی، ۱۹۶۸ء۔
۷۔ فلیمون حکیم کارروائی پاکستان سائنس فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۶۷ء۔
۸۔ بارہ ماسہ، صحیفہ لاہور، ۱۹۶۸ء۔
۹۔ سیرہ ابن ہشام کا ایک نادر قلمی نسخہ ترجمان الحدیث، ۱۹۶۹ء۔
۱۰۔ قتیلہ اور اس کا مرثیہ ترجمان الحدیث، ۱۹۷۰ء۔
۱۱۔ محمد بن ابوزید الامن ھوری اور اس کی تفسیر ترجمان الحدیث، ۱۹۷۰ء۔
۱۲۔ محمد امین فارسی کے ترجمہ قرآن مجید کا ایک نادر نسخہ ترجمان، ۱۹۷۰ء۔
۱۳۔ محمد طاہر پٹنی، معارف لاہور، ۱۹۷۱ء۔
۱۴۔ غزنوی دَور کا عربی ادب مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء۔
۱۵۔ الحجر بھا بیوت قبور منحل جدہ، اپریل جون، ۱۹۷۱ء۔
۱۶۔ لم تکن الحجر مقبرہ بل کانت مدینہ عامرہ المدینہ جدہ، ۱۹۷۱ء۔
۱۷۔ مدائن صالح و ما جاورھا الرسالۃ الاسلامیہ بغداد، ۱۹۷۲ء۔
۱۸۔ المغارات بالحجر دی جنرل آف دی اسلامک یونیورسٹی مدینہ، ۱۹۷۲ء۔
۱۹۔ مجد دالف ثانی شام ہمدرد لاہور، ۱۹۷۲ء۔
۲۰۔ The Burning Glasses of Ibn-alHaitham, in the proceedings of the Millonary of Ibn-al-Haitham. Karachi, 1970.
۲۱۔ Source Books of K. Al Saidanna, in Albiruni International Congress, Lahore, 1973.

دائرہ معارف اسلامیہ کے قابل ذکر مقالات:

آب، آبان، آت میدان، آدم، آذر ماہ، آزر، آسیہ، آمدی، ابراہیم، ابلیس، ابن اعثم کوفی، ابن حمدون، ابن حمدیس، ابن الفوطی، ابن قدامہ، اسلام، اصحاب ایکہ، اصحاب بدر، امی، ٹھٹہ، ثناءاللہ پانی پتی، جلال الدین قزوینی، یاقوت الحموی۔

محمد فیروز شاہ

اُجالے مرنہیں جاتے

کبھی رات صبح کو مات دے سکی ہے؟

سات برس پہلے کی ایک یاد آج تک دل کو شاد آباد رکھے ہوئے ہے۔ اب ڈاکٹر بیدل حیدری کے انتقال پر ملال سے برباد ہو جانے والی اس نگری میں اس صبح و شام کا عکس جاگتا ہے جب بڑی رونقیں ہو گئی تھیں فقیروں کے ڈیرے ___ صبح کی رعنائی میں کسی پر اثر تخلیقی توانائی کا رنگ شامل ہو جائے تو لمحے چمک اُٹھتے ہیں اور شامیں کسی شاعری کو ساحری میں بدلتے بچشم خود دیکھ لیں تو ڈوبتے سورج کی سرخی میں لہو رنگ جذبوں کی ترنگ دمک اُٹھتی ہے۔ ۸/نومبر ۱۹۹۷ء ایک ایسی ہی یادرہ جانے والی صبح و شام کے دوام سے مہکتی ہے۔ خوشبو میں بھی ایک روشنی ہوتی ہے اور روشنی کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ آپ اس روز میرے ہمراہ ہوتے تو میں صبح کالج کی تقریب اقبال اور ساعتِ عصر میں بزمِ شعر میں بیدل حیدری کے دل پذیر کلام کی کمک سے معطر اجالوں کے حوالے آپ کے دامن میں بھر دیتا۔ جن دامنوں میں شاعری کا نور و سرور بھر جائے وہ کبھی خالی نہیں ہوتے۔ چاندنی بھرے آنگنوں اور شاعری بھرے دامنوں کا حسن دل موہ لینے والا ہوا کرتا ہے ___ کبھی پورے چاند کی رات کھلے صحن میں بیٹھ کر بیدل حیدری کی شاعری پڑھیے ___ میری بات کی گرہ اس خوبی سے کھلے گی کہ ایک منور مہکار سحر دم جاگتے پرندوں کی چہکار جیسی اپنائیت بھرے نکھار کے ساتھ آپ کو اپنے ہالے میں لے لے گی ___ جیسے اب میں برسوں پہلے کی اس صبح کی تاثیر بیدار ہوتے دیکھ رہا ہوں جب میری دعوت پر بیدل حیدری ہمارے کالج میں تشریف لائے تھے۔ وہ مجلس اقبال کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ اہل میانوالی کے دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی شاعری اس خوب صورت ہال میں گونج رہی تھی اور اہل دل جان رہے تھے کہ سچی شاعری کی تاثیر کیسے دلوں کو اپنی جاگیر بنا لیا کرتی ہے اسی شام میرے مکان پر بزم شعر و ادب میانوالی نے محفل شعر آراستہ کی تو غروب ہوتی کرنوں نے طلوع ہوتی شاعری کے مدار میں دلدار جذبوں کی روشنی تقسیم ہوتے دیکھ کر مطمئن مسرت کے ساتھ رختِ سفر باندھا بیدل حیدری کلام سنا رہے تھے اور دل دروازے کھلتے چلے جا رہے تھے

یہ کیا ضرور مسافر گھروں کو لوٹ آئیں — کہ اب سفر کا نیا نام بے گھری بھی تو ہے
پڑاؤ ڈالنا ظلمت میں بزدلی بھی تو ہے — کہ اگلے موڑ پہ سورج کی چھاؤنی بھی تو ہے
نہیں ہے ایسے ہی شوقِ مصوری مجھ کو — کبھی کبھی کوئی تصویر بولتی بھی تو ہے

لفظ تصویر کر لینے والے لوگ حرفوں کو گویائی کا ہنر عطا کرتے ہیں تو آنکھوں اور ہونٹوں پہ ایک

ہی جاوداں منظر پینٹ ہو جاتا ہے۔ شاعری شوق مصوری سے جدا تو نہیں فرق تو فقط رنگوں اور لفظوں کا ہے اور جسے کہنے کا سلیقہ عطا کیا گیا ہے اسے برش اور قلم کے فرق سے کچھ فرق نہیں پڑتا ___ اب اس روز میں عجب خان کے نگار خانہ ___ ڈیرہ اسماعیل خان ___ میں بیٹھا اس کے فن پارے دیکھ رہا تھا تو بیدل حیدری کا شعر ایک بار پھر زندہ تر ہو گیا تھا ___ ایسے اشعار تو سدا بہار ہوا کرتے ہیں۔ زندگی ان کی کمک سے تابندگی پاتی ہے۔ عجب خان کو ایوارڈز پر ایوارڈز مل رہے ہیں مگر میرے نزدیک تو اہمیت اس ایوارڈ کی ہے جو اس کے لیے اس کے فن پارے دیکھنے والوں کی آنکھوں اور اس کے خلوص کے حصار میں محصور ہو جانے والے دلوں میں چمکتے دمکتے ہیں کہ جو ایوارڈ دل نگری سے عطا ہوتا ہے اس کی آب و تاب جاوداں ہوتی ہے اب دیکھئے بیدل حیدری نے کب ایوارڈ لینا پسند کیا مگر عطا کرنے والے نے اس کی شاعری کو قلوب کی ساحری کے اعزاز سے سرفراز کیا تو وہ یہاں سے جا کر بھی ہمارے دلوں سے نہ جا سکے ___ مولانا رومؒ نے فرمایا تھا: ''جب ہم چلے جائیں تو ہمیں ہماری قبروں میں نہیں ___ لوگوں کے دلوں میں تلاش کرنا۔''

دلوں کے درسب پر نہیں کھلا کرتے۔ لمحۂ تخلیق جس کے خلوص فن کی تصدیق کرتا ہے صرف وہی امر ہوتا ہے۔ ورنہ موت بڑی ظالم ہے۔ سب کو لے جاتی ہے۔ ہاں مگر جن کے من میں سچے جذبوں کی لگن لو دیتی ہو اور جن کی آنکھوں میں صادق نیتوں کی ضو جاگتی ہو ___ وہ اپنے لگائے ہوئے پودوں کی چھاؤں میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ شاعری بھی تو شجر کاری ہے شرط فقط یہ ہے کہ جاوداں جذبوں کے آب حیات سے سینچے ہوئے لفظوں سے آبیاری کی جائے۔ جیسے اس شام بیدل حیدری غزل سنا رہے تھے اور زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ___ اب تک سن رہا ہے!!

مجھے گھومنا نہیں چاک پر مرے کوزہ گر — مرے ارتقا سے نہ ہاتھ کر مرے کوزہ گر
مجھے گھگھوؤں کی نہ شکل دے مجھے بخش دے — مرے خدوخال پہ رحم کر مرے کوزہ گر
میں تو آج بھی وہی خاک ہوں ترے پاؤں کی — تجھے کیا ملا مجھے روند کر مرے کوزہ گر
مجھے دوسروں سے مماثلت نہیں چاہیے — مجھے اپنے طور پہ خلق کر مرے کوزہ گر
میں نہیں بنا ہوں تو مت بنا مجھے بھول جا — جو میں بن گیا ہوں تو رنگ بھر مرے کوزہ گر

یہ لاڈ ___ محبتوں پر مان کرنے والے ہی کیا کرتے ہیں۔ سبھی کو یہ مقام بھی ودیعت نہیں ہوتا ___ ریاکاری کی آلودگیوں میں سچ سے وابستہ لوگ ہی محبت کے اہل ہو سکتے ہیں اور اہلِ محبت ہی مان کیا کرتے ہیں ___ محبت میں صداقت ہو تو اس عظیم جذبے کا خالق مان کا بھرم ٹوٹنے نہیں دیا کرتا ___ دیکھئے تو سہی ___ اس عظیم کوزہ گر نے اس گلِ کوزہ میں کیسا شاندار رنگ بھرا ___ کہ اب تا ابد زندہ امنگ کی ہر ترنگ میں اس خوب صورت شاعری کا آہنگ گونجتا رہے گا۔ ابھی موسمِ گرما پوری طرح آیا نہیں ہے مگر آج دھوپ میں ذرا دیر کو بیٹھنا پڑا تو دوپہر نے بہت بھید بھری گرہیں کھول دیں یوں لگا جیسے ہر شعبۂ حیات کو دھوپ روپ کا کڑا پن اپنی گرفت میں لے چکا ہے ___ تب بیدل حیدری نے سارا راز فاش کر دیا۔

یہ ہم نے دھوپ جو اوڑھی ہوئی ہے ہماری چھاؤں چوری ہو گئی ہے

جس گاؤں کی چھاؤں چوری ہو جائے۔ وہاں ماؤں اور دعاؤں سے محرومی کا دکھ ایک کڑے عذاب کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لباس تک بھی پہننے کا قرینہ کھو جاتا ہے۔ بیدل نے سچ ہی تو کہا تھا:

بیدل لباسِ زیست بڑا دیدہ زیب تھا اور ہم نے اس لباس کو الٹا پہن لیا

ملبوسات کو خرافات سمجھنے والوں کے لیے تو شاید الٹا سیدھا کوئی مفہوم ہی نہ رکھتا ہو مگر راہِ راست کے عادی مسافروں کو طویل مسافتوں میں اپنی سچی سیدھی روایتوں کی صداقتوں ہی سے نشانِ منزل اخذ کرنا ہوتا ہے۔ شاعر تو ہوتا ہی سچ کا سفارت کار ہے۔ اسے تو کٹھنائیاں جھیل کر بھی سچے سہانے زمانوں کے آستانے تلاش کرنا ہوتے ہیں۔

شاعر کی زندگی ہے پیمبر کی زندگی جب دیکھئے کسی نہ کسی ابتلا میں ہے

ابتلائیں تو سچے لوگوں کے سدا ہم رکاب رہتی ہیں کہ انہی خزاؤں کی کوکھ سے انہیں آئندہ بہاروں کے امکانات کھوجنا ہوتے ہیں۔

ترا بیمار اچھا ہو رہا ہے یہ پہلی بار ایسا ہو رہا ہے

شاعر یاس اور آس کی بے کراں وسعتوں کے درمیان کھڑا ہو کر نئے زمانوں کی روشنیوں کا سراغ لگانے کا منصب دار ہوتا ہے اور یہ روشنی دراصل اس کے فکر و اُسلوب کی چاندنی سے جنم لیتی ہے۔ میں نے ٹی ایس ایلیٹ کی اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ''اور جینئلٹی کا خیال ایک دھوکہ کے مترادف ہے'' میں سمجھتا ہوں اور جینئلٹی نہ ہو تو زندگی تخلیقی شرمندگی سے ہار کر خود سے بیزار ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں نہ ہو تو سنی ہوئی آوازوں دیکھے ہوئے منظروں اور برتے ہوئے رویوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں اکتاہٹ کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے ___ اکتائے ہوئے لوگ زندگی کو روگ کی طرح بھوگ رہے ہوتے ہیں جب کہ تخلیق کار زندگی کا رازدار ہوتا ہے ___ سفیرِ بہار ہوتا ہے اسے تو دکھ جھیل کر بھی سُکھ بانٹنا ہوتے ہیں کہ اس کا منصب ___ کانٹوں کا نہیں، پھولوں کا ہم جنیں ہوتا ہے۔ اسے تو نکھار اور مہکار ہی کا تقسیم کار ہونا ہوتا ہے۔ پروٹا گورس نے ناانصافی کا دکھ سہارنے کو خود ناانصافی سے زیادہ ہتک آمیز قرار دیا تھا۔ بیدل حیدری کی شاعری اس سچائی کی بہت پرتاثیر تخلیقی گواہی ہے

احتجاج اور دعاؤں کی فضا کے مابین دشتِ آفاق میں پھیلے ہوئے بازو برحق

بیدل حیدری کے شعری شعور میں حرفِ حق کا ظہور اساسی اثاثہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی کچھ ایسے ہی صادق رویوں کے حامی تھے۔ جھوٹ ان سے برداشت نہ ہوتا تھا ___ اس شام مجھے کہنے لگے ___ ''شاہ جی! آپ کو یاد ہے ___ ہماری پہلی ملاقات برسوں پہلے شیخوپورہ مشاعرہ میں ہوئی تھی'' میں نے کہا ___ ''بالکل! وہ تو یادگار تقریب تھی۔ بہت اچھی شاعری سننے کو ملی تھی۔'' انہوں نے

فوراً کہا ''مگر مجھے اس شام دونوں رنگوں سے واسطہ پڑا ___ محبت کے بہاریں رنگ اور تخلیقی ترنگ کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کی احسان فراموشی کا بھی پردہ چاک ہوا اور میری انگلی پکڑ کر چلنے والے مجھی پر انگلی اُٹھانے لگے۔'' ان کے لہجے میں دکھ کا عنصر بہت گہرا تھا میں نے اس آنچ کو دھیما کرنے کی کوشش میں کہا۔ ''مگر وہاں تو سب آپ سے محبت کرنے والے تھے ___ میزبان بھی مہمان بھی ___''

''ہاں یار ___ مگر میرے اپنے ___ جو میرے اپنے ثابت نہ ہوئے ___''

میں نے ان کے کرب کو محسوس کر کے بات کا رخ بدل دیا مگر انہیں ہمیشہ اپنے کچھ شاگردوں سے کچھ شکوے رہے ___ کاش! تلامذہ اپنے اساتذہ کو بہرصورت گلہ کا موقع نہ دینے کی روش اپنا لیں ___ طاہر شیرازی کا شعر ہے

سویرے رات کی تاریکیوں سے ڈر نہیں جاتے
اندھیرے چھا بھی جائیں تو اُجالے مر نہیں جاتے

☆☆☆

تبصرہ نگار: ڈاکٹر انور سدید

سوال یہ ہے؟

(مرتبہ: نوشی انجم)

سوال زندگی کے جمود کو توڑنے اور اس کے باطن سے حقیقت کا نیا جہان تلاش کرنے کا وسیلہ ہے۔ سوال انسان کو زندگی کے پیش پا اُفتادہ راستے سے ہٹ کر نئی سوچ پر ڈالنے اور نئے نتائج دریافت کرنے کا عمل ہے۔ سوال ماضی کو اِس کے تمام فکری سرمایے سمیت پیچھے چھوڑ کر نئے اَفکار کا منہ بند سیپ کھولتا اور ہمیں علومِ نو سے آشنا کرتا ہے اور اِس طرح یکسانیت میں جدّت کا آفتاب روشن کر دیتا ہے۔ یہ چند باتیں مجھے محترمہ نوشی انجم کی زیرِ تبصرہ ضخیم فکر انگیز اور معنی خیز مرتبہ کتاب ''سوال یہ ہے؟'' (اشاعت ۲۰۰۴ء) دیکھ کر سوجھیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ نوشی انجم نے اِس کتاب کے سوالات خود نہیں اُٹھائے بلکہ یہ وہ سوالات ہیں جو عہد ساز ادبی رسالہ ''اوراق'' کے صفحات پر ۱۹۶۶ء کے اوائل میں اُبھرنا شروع ہوئے اور پھر ایک تہائی صدی کے طویل عرصے تک اَدب کے موضوعات کو منوّر کرتے رہے۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین احمد کی وفات کے بعد رسالہ ''ادبی دنیا'' دوسرے ہاتھوں میں منتقل ہو جانے کے بعد جب یہ سوچا کہ اب ''ادبی دنیا'' میں مولانا کے ادبی مشن کی جہت میں تبدیلی ہو جائے گی تو انہوں نے مولانا صلاح الدین احمد کی جدیدیت کے زاویوں کو قائم رکھنے بلکہ کچھ زیادہ روشن کرنے کے لیے رسالہ ''اوراق'' جاری کیا۔ اور اِس میں ''سوال یہ ہے؟'' کے عنوان سے یہ نیا سلسلۂ مضامین میں شروع کیا۔ جس کے بنیادی سوال خود ڈاکٹر وزیر آغا نے اُٹھائے اور اِس پر مذاکرہ اُس دور کے بیشتر اہم ادبائے کرام کرتے اور یوں مرکزی سوال کے باطن سے جوابات کے نئے نقطے اُبھرتے چلے جاتے۔ بعد میں یہ مذاکرہ پوری ادبی دنیا میں پھیل جاتا اور تحرک و حرارت پیدا کرتا جس کے بہت سے نقوش ''اوراق'' کے اگلے شمارے میں ''آپس کی باتیں'' کے حصے میں شائع ہوتے۔ یہ سلسلہ اِتنا مقبول ہوا کہ ایک طویل عرصے تک اِسے ''اوراق'' کی انفرادیت شمار کیا گیا اور اِس سے نہ صرف ادیبوں اور دانشوروں نے استفادہ کیا بلکہ طلبہ کے لیے اِن مضامین نے بے حد قیمتی مواد فراہم کیا جو انہیں اپنے کالج اور یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ سے دستیاب نہیں ہو سکتا تھا نہ اُن کی رسائی اُن سوالات کے جواب اور اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے والوں تک ہو سکتی تھی۔ میرے دوست محمود اسیر نے اُن کی فہرست ''اوراق'' کے پینتیس سالہ خاص نمبر میں بھی شامل کی ہے۔ اِن مضامین کے عنوانات پڑھ کر ہی قارئینِ ادب نے اُن کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا مطالبہ شروع کر دیا بلکہ دعویٰ کیا کہ جس غیر

جانبداری سے یہ مضامین لکھے گئے اور موضوع کے گوشے اُبھارے گئے اُس کی دوسری مثال موجود نہیں۔

قارئین کے لیے یہ بات نہایت دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جب اہلِ ادب ڈاکٹر وزیر آغا سے ''سوال یہ ہے؟'' کی کتابی شکل کا تقاضا کر رہے تھے تو ملتان سے نوشی انجم نے اپنے طور پر اور خود اپنی داخلی تحریک سے اِس کام کو تکمیل تک پہنچا بھی دیا تھا یعنی اُنہوں نے دن رات محنت کر کے اور سرکاری لائبریریوں اور نجی کتب خانوں کی خاک چھان کر ''اوراق'' کے پرانے پرچوں سے ''سوال یہ ہے؟'' کے مباحث جمع کر لیے۔ اُن پر رشید امجد صاحب سے پیش لفظ بھی لکھوالیا اور پھر ڈاکٹر وزیر آغا کو اطلاع دی تو وہ خوشی سے کِھل اُٹھے اور بے اختیار کہا: ''یہ میرا ایک خواب تھا جو نوشی انجم کی مساعی سے پورا ہوا ہے۔''

اِس نوع کی علمی، ادبی اور فکری کتاب کو مرتّب کرنا اور اِن مباحث کو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں نوشی انجم کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ فی زمانہ کوئی شخص اِس کا بیڑا اُٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ ''سوال یہ ہے؟'' کا آغاز وزیر آغا نے کیا تھا، اُسے پروان ''اوراق'' نے چڑھایا، اُس کی آبیاری میں دو سو سے زائد نامور ادیبوں اور اہلِ نظر دانشوروں نے حصّہ لیا لیکن کتابی صورت میں شائع کرنے کا اعزاز نوشی انجم نے حاصل کر دیا اور آئندہ یہ کتاب اُنہیں کے نام سے موسوم ہوگی کیونکہ اِس کی تالیف میں اُنہوں نے جو محنت کی وہ کوہِ بے سطور سے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ نوشی انجم! میں آپ کو اِس کارنامے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں اِس کے پیش لفظ لکھنے کا اعزاز بھی آپ نے مجھے عطا کیا۔ میں ''سوال یہ ہے؟'' اور ''اوراق'' کا پہلا قاری ہوں، لیکن اب میرے لیے یہ کتاب ہی اوّلین حوالے کی کتاب شمار ہوگی جس کی محنت کا تقاضا ہے کہ اُس کی مولفہ کو تمغۂ امتیاز قسم کا ایوارڈ بلا تردّد اور بلا تاخیر پیش کر دیا جائے اور اِس کتاب کو ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے مقالات کے اہم مطالعہ کی کتاب قرار دے کر شاملِ نصاب کیا جائے۔

اِس کتاب میں.....نثر اور شعر کا ذوق.....معنی کا معنی.....اسلوب کیا چیز ہے.....انشائیہ.....سفر نامہ.....تجریدی افسانہ.....علامتی افسانہ ایک منفی رجحان جیسے موضوعات پر ہندو پاک کے دو سو ادیبوں نے اپنے خیالات رقم کیے ہیں۔ یہ مباحث بیسویں صدی کے تھے جنہیں اب نوشی انجم نے اکیسویں صدی میں داخل کر دیا ہے تو ہم اِس پر ایک مرتبہ پھر تازہ نظر ڈال کر نئے نتائج برآمد کر سکتے ہیں۔ میں نے یہ کتاب پڑھی تو متعدد مقامات پر خود اپنے خیالات سے وہ اختلاف پیدا ہوا جو نئے مطالعے کی روشنی میں سوچ کا اگلا قدم اُٹھانے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ کتاب اساتذہ کو ورق ورق پڑھنی اور پھر اس کے معنی و مطالب اپنے طلبہ کو سمجھانے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ ''سوال یہ ہے؟'' ۲۰۰۴ء کی پہلی اہم کتاب ہے جس کا ذکر تادیر ادبی حلقوں میں ہوتا رہے گا اور نوشی انجم کی محنت کی داد دی جاتی رہے گی۔ ۶۷۲ صفحات کی کتاب میں کم از کم ڈیڑھ ہزار صفحات کا مواد شامل کر دیا گیا ہے۔ بیکن بکس ملتان، لاہور اِس کتاب کے ناشر ہیں۔

غزلیات

قاضی حبیب الرحمٰن

دل کی گہرائیوں سے کوئی صدا آئے کبھی
نظر آواز کی صورت میں خدا آئے کبھی

کب سے خورشید بکف ڈھونڈ رہا ہوں اُس کو
روبرو - سایۂ دیوارِ انا آئے کبھی

ہائے وہ جانِ تصور ، وہ جمالِ معنی
خلوتِ ذہن میں چپکے سے چلا آئے کبھی

دشتِ احساس میں دم گھٹتا ہے، جی رُکتا ہے
اے وہ صرصر ہی سہی ، تازہ ہوا آئے کبھی

یہ مرے دل کی کلی کھل کے گلستاں ہوجائے
تیرے کوچے سے مگر بادِ صبا آئے کبھی

لَو نہ دے اُٹھیں اندھیرے تو مرا نام نہیں
اک ذرا ہاتھ ، ترا بندِ قبا آئے کبھی

میں بھی تا دیکھ سکوں اپنی بہارِ امکاں
میرے آئینے میں بھی عکس ترا آئے کبھی

گرم رفتارِ احباب سے دل سرد ہوا
اس نواحی میں کوئی آبلہ پا آئے کبھی

قرن ہا قرن پہ پھیلا ہوا وہ ایک ہی شخص
اپنے ہونے سے جو ہے عہدہ برا آئے کبھی

اک اُسی چہرے میں گم ہوگئے سارے چہرے
وہ جو ہے سب کی طرح، سب سے جدا آئے کبھی

دُور کے سارے مناظر مرے اپنے ہوجائیں
میری ہستی میں اک ایسا بھی خلا آئے کبھی

فن کی گیرائی زمانوں کا احاطہ کر لے
سوچتے لمحوں کی گمبھیر گھٹا آئے کبھی

عرصۂ شوق میں ہے محوِ سفر کب سے حبیب
ایک اُمید کہ وہ جلوہ نُما آئے کبھی

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

ٹھہر گیا ہے کوئی ستارہ کہیں اُفق پر
مرے نگر کو میسر کہاں زمیں کی مہک

کہ جھلملاتا ہے وہ گلِ یاسمیں اُفق پر
بکھر رہی ہے فضاؤں میں یاسمیں کی مہک

میں اُس کے ریزوں کو اپنی پلکوں سے چُن رہا ہوں
مجھے پسند فقط اپنے گھر کی خوشبو تھی

بکھر گیا ہے اک آئنہ نیلمیں اُفق پر
مگر نصیب ہوئی اور ہی کہیں کی مہک

ردائے شمعِ سحر تو پہلے ہی گر چکی ہے
قدم قدم پہ مرے راستے میں آتی ہے

مگر وہ شاخِ گلاب بھی اب نہیں اُفق پر
شجر شجر میں اُسی نخلِ اوّلیں کی مہک

اُترنے والی ہے سطحِ آئینہ پر سیاہی
کوئی غرض نہیں تشکیک کے زمانے سے

رُکی ہوئی ہے صباحتِ اوّلیں اُفق پر
مرے گمان پہ حاوی ہے اب یقیں کی مہک

مری طرف دیکھتی ہیں حیرت سے کہکشائیں
طلسم شب میں بناتا ہوں راستہ میں بھی

کہ پاؤں دھرنے کی منتظر ہے زمیں اُفق پر
کشید کرتے ہوئے صبحِ نیلمیں کی مہک

خُمار سے بند ہو چکی ہیں ہماری آنکھیں
وہ مہرِ ہجر مہکتا ہے میرے پہلو میں

اُنڈیل دی ہے کسی نے کیا انگبیں اُفق پر
کہ آ رہی ہے کسی خواب دل نشیں کی مہک

فقط غبارِ نظر دکھائی دیا ہے ساجدؔ
بچھڑنے والوں کو ساجدؔ بچھڑ کے رہنا ہے

نگاہ کی ہے اگر دمِ واپسیں اُفق پر
مکاں کے ساتھ رہے گی مگر مکیں کی مہک

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

بچھڑ چکے ہیں مگر میرے ہم نشیں بھی ہیں
وہ مجھ سے دور نہیں ہیں، جہاں کہیں بھی ہیں

تمام رات دمکتے ہیں جو مری چھت پر
وہی ستارے مرے دل میں جاگزیں بھی ہیں

مرا چراغ ، مرا آئنہ ، مری آنکھیں
مرے وجود کا حصہ بھی ہیں ،نہیں بھی ہیں

اسیرِ دشتِ جنوں رہ نہ پائیں گے وہ لوگ
جو میری طرح کسی شہر کے مکیں بھی ہیں

میں خوش نہیں ہوں فقط سلطنت کی وسعت پر
مرے حضور میں بلقیس سے حسیں بھی ہیں

خوشی یہ ہے ، مری تاریخ کے سبھی کردار
مرے علاوہ مرے عصر سے قریں بھی ہیں

مری سپاہ ہی ساجدؔ نہیں مرے ہمراہ!
مرے جلو میں کئی خوابِ دلنشیں بھی ہیں

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

آسماں میرا ہدف ہے نہ زمیں میری اسیر
کوئی صورت ہے مگر اور کہیں میری اسیر

حق جتاؤں گا میں کیا ساعتِ آئندہ پر
جب یہ موجود روایت ہی نہیں میری اسیر

کچھ نہیں تھا مرے قبضے میں بجز وہم و گماں
میں سمجھتا تھا کہ ہے شمعِ یقیں میری اسیر

ایک مدت سے مسلّط ہے ملکِ رے پر
شام تک ہوگی وہی تخت نشیں میری اسیر

عین ممکن ہے ہزیمت ہی اُٹھانی پڑ جائے
کیا ضروری ہے کہ ہو فتحِ مُبیں میری اسیر

زور چلتا ہے مرا ، میری سپر پر ساجدؔ
ہو نہ پائے گی مری تیغِ حسیں میری اسیر

خاور اعجاز

باغِ وجود لگتا ہے دشتِ فنا کا عکس
آیا ہے ابتداء میں یہ کس انتہا کا عکس

موسم بدل رہا ہے ترے اعتبار کا
ہر رنگ میں جھلکنے لگا ہے انا کا عکس

پھر یوں ہوا کہ موسمِ سرما کی ایک رات
پانی پہ جم کے رہ گیا چلتی ہوا کا عکس

آنکھوں میں ایک سادہ سی تصویر تھی مگر
دل کے نگار خانے میں اُترا بلا کا عکس

کس رُخ اُتر گیا ہے ہمیں بھی خبر نہیں
آئینے تک تو آیا تھا اُس کی قبا کا عکس

☆☆☆

خاور اعجاز

دُھند کی منزل سے بے خوف گزر نہیں پاتے
آنکھیں کھول کے بھی تو ہم کچھ کر نہیں پاتے

جن کو سودا ہو پاتال کو چھو لینے کا
ساری عمر وہ دریا پار اُتر نہیں پاتے

راتوں رات ثمر لے آنے کی خواہش میں
خواب شجر پر دل کے پھول اُبھر نہیں پاتے

اس کی ہمراہی کے اثر میں کھلتے جائیں
جس پرواز کی جرأت بال و پر نہیں پاتے

ہم سادہ لوحوں کی یہ مجبوری بھی ہے
اپنی باتوں سے ہم لوگ مُکر نہیں پاتے

خاور اعجاز

کتنے موسم آئے بیتے رُت بدلی کئی بار
اب تک لیکن اُسی طرح ہے بچپن کی مہکار

اِک اِک پتھر رکھتے رہتے ہیں برسوں تک لوگ
آخر اِک دن بن جاتی ہے رستے میں دیوار

کس کو نیلی کٹیا میں رہتا ہے میرا دھیان
کون مجھے روزانہ پہنچاتا ہے اپنا پیار

کھوج میں جانے والے ہو رہتے ہیں اُس کے ہی
ایک دیا جلتا رہتا ہے دریا کے اُس پار

ایک حقیقت سے بندھ جانے میں عافیت ہے
ہونے اور نہ ہونے کے سب جھگڑے ہیں بیکار

☆☆☆

خاور اعجاز

خلاف متن مرے حاشیہ مخالف ہے
کتابِ زیست کا ہر فیصلہ مخالف ہے

کہیں کہیں پہ مرا ساتھ چھوڑ جاتا ہے
مرے وجود میں وہ جو مرا مخالف ہے

اک انتہا پہ پہنچ کر مجھے ہوا معلوم
چلا ہوں جس پہ وہی راستہ مخالف ہے

بدل رہا ہے مرے منظروں کا پس منظر
فراتِ وقت کی آب و ہوا مخالف ہے

مزاجِ دہر سے ملتا نہیں مزاج مرا
کبھی چراغ کبھی آئنہ مخالف ہے

فہیم شناس کاظمی

ہم اپنی نفی نہ اپنا ثبات چاہتے ہیں
جو چاہتے ہیں تو ناممکنات چاہتے ہیں

کمال لوگ ہیں ان کی طلب کمال کی ہے
کہ ایک سمت نہیں شش جہات چاہتے ہیں

جنونِ عشق میں شوریدہ سر ہوئے ایسے
ہم ایک ذات نہیں کائنات چاہتے ہیں

یہ اور بات کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا
ہم اس جہان میں غم سے نجات چاہتے ہیں

بس اپنی ذات میں ہم اس کو دیکھنا چاہیں
بس اپنی ذات میں ہم اس کی ذات چاہتے ہیں

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

ہر ایک سمت ہی آنے لگی نظر مٹی
جمی ہے آنکھ کے پردے پہ اس قدر مٹی

محبتوں میں یہ بہتی ہے ساتھ دریا کے
پلٹ دے دھارے کو اپنی پہ آئے گر مٹی

ہر ایک عہد کی تاریخ کا مقدر ہے
ہر ایک عہد میں کرتی رہی سفر مٹی

کسی گلاب کی خوشبو نہ کوئی بوئے نفس
ہمارے ہاتھ میں کیا آیا چھان کر مٹی

نہ آسماں سے غرض اور نہ کچھ زمانے سے
شناس ہم ہیں اسی سمت ہو جدھر مٹی

حصیؔر نوری

محبت کی کرشمہ سازیاں محسوس کرتا ہوں
جہاں ہوتا نہیں ہوں میں وہاں محسوس کرتا ہوں

نہ جانے آنے والا وقت کیا پیغام لاتا ہے
مگر فی الوقت تو دردِ نہاں محسوس کرتا ہوں

لگی ہے آگ میرے خرمنِ دل میں کہیں شاید
میں اپنے قریۂ جاں میں دھواں محسوس کرتا ہوں

میں مخفی رکھ رہا ہوں دل کی ہر اک بات کو لیکن
مگر کچھ کہہ نہ دے اشکِ رواں محسوس کرتا ہوں

وہی ہے رنگِ محفل بھی وہی ہم بھی وہی تم بھی
مگر دیوار سی اک درمیاں محسوس کرتا ہوں

مری محرومیاں ہی بن گئیں مجبوریاں میری
دکھوں کی ناؤ کو بے بادباں محسوس کرتا ہوں

اذیت ناک ہیں اس دَور کی رنگینیاں یارو
مگر ان میں بھی کچھ سود و زیاں محسوس کرتا ہوں

حصیؔر اس دَور میں کوئی نہیں اپنا تو کیا غم ہے
خدا کی ذات کو میں مہرباں محسوس کرتا ہوں

حصیؔر نوری

پھول کی ہوتی ہے جس طرح گزر خار کے ساتھ
اس طرح عمر کٹی ہے مری آزار کے ساتھ

زندگی نام ہے مضبوطیٔ کردار کے ساتھ
عزم ہوتا ہے سدا عشق کے پندار کے ساتھ

زندگی کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اس نے
چھوڑ دی کشتیِ جاں ہم نے بھی پتوار کے ساتھ

شور جو آج مچاتے ہوئے آتے ہیں نظر
وہ بھی لگ جائیں گے اک دن کسی دیوار کے ساتھ

فن کی عظمت کہاں تسلیم ہوئی ہے اب تک
لوگ آواز لگاتے رہے فنکار کے ساتھ

آج کے دَور کا ہے سب سے بڑا جرم یہی
سودے بازی نہ کرے کوئی بھی حق دار کے ساتھ

ہم تو آپس ہی میں ہیں دست و گریباں کب سے
مسئلے طے ہوا کرتے ہیں سدا پیار کے ساتھ

اس سے ملنے میں جھجک سی مجھے ہوتی ہے حصیؔر
جس کا برتاؤ نہیں اچھا مرے یار کے ساتھ

☆☆☆

پرویز ساحؔر

جینے سے جدا معاملہ ہے
یہ عشق بڑا معاملہ ہے

تم بیچ میں کیوں اُلجھ رہے ہو؟
یہ اُس کا مرا معاملہ ہے

ہر شخص خفا خفا ہے مجھ سے
آخر کو یہ کیا معاملہ ہے؟

کوئی بھی سمجھ سکے نہ جس کو
تقدیر ایسا معاملہ ہے

اُس کے مرے درمیان ساحؔر
اک خواب نما معاملہ ہے

پرویز ساحؔر

امیرِ وقت مُصر ہے کہ ہاں گرا دیئے جائیں
نواحِ شہر کے سارے مکاں گرا دیئے جائیں

ہم اس لیے بھی ہوا کی مخالفت نہیں کرتے
کہ یوں نہ ہو کہیں قبل از خزاں گرا دیئے جائیں

کچھ اہلِ علم بضد ہیں کہ نفرتوں کے سبھی بُت
بزورِ خنجر و تیغ و سناں گرا دیئے جائیں

میں اپنے قول سے منکر کبھی ہوا ہوں، نہ ہوں گا
کہ چاہے سر پہ مرے آسماں گرا دیئے جائیں

یہ چند پیڑ جو جنگل میں رہ گئے ہیں سلامت
وہ چاہتے ہیں، یہ بھی رائگاں گرا دیئے جائیں

ابھی تو ہم نے ہواؤں کا رُخ بدلنا ہے ساحؔر
ابھی سے کیسے بھلا بادباں گرا دیئے جائیں

☆☆☆

پرویز ساحرؔ

سا رے گا ما پا دا نی
کیا ہے ترا ارادہ نی؟

پھر اُس شخص کو چاہے ہے
دل ہے کتنا سادہ نی

میری عمر سے بھی بڑھ کر
غم ہیں مرے زیادہ نی

اہلِ ہوس کے ہوش اُڑائے
تیرا تنگ لبادہ نی

مجھ سے مت گھبرا کُڑیے!
میں تیرا دل دادہ نی

تُو کیا جانے شانِ فقیر
تُو ٹھہرا شہزادہ نی

اُس کی جدائی کے غم نے
کر دیا مجھ کو آدھا نی

یاد کرو تم نے ساحرؔ
مجھ سے کیا تھا وعدہ نی

پرویز ساحرؔ

مسلسل سوچنے والوں میں شامل ہیں
کہ ہم بھی جاگنے والوں میں شامل ہیں

ہمیں بھی اک نظر تم پیار سے دیکھو
تمہارے چاہنے والوں میں شامل ہیں

ہم ایسا کوئی بے حِس اور کیا ہوگا
تماشا دیکھنے والوں میں شامل ہیں

بھلا سے کوئی مانے یا نہیں مانے
ہم اُس کے ماننے والوں میں شامل ہیں

ہمارا نام بھی دیوار پر لکھو
کہ ہم بھی بولنے والوں میں شامل ہیں

خدا کی شان ، ہم سے خاک زادے بھی
ستارے توڑنے والوں میں شامل ہیں

ہمیں معلوم ہے ، اس عشق کا انجام
جدائی جھیلنے والوں میں شامل ہیں

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ساحرؔ
ازل سے بھولنے والوں میں شامل ہیں

☆☆☆

محمد فیروز شاہ

جب مسافر چلے اک ریا کار عزم سفر اوڑھ کر
یاس کی گود میں منزلیں سو گئیں رہگذر اوڑھ کر

شیشہ گر شہر میں نور کے زاویے منقلب ہو گئے
عصرِ موجود بھی جلوہ فرما ہوا عکسِ زر اوڑھ کر

منتظر آنکھ میں گمشدہ خواب سے وصل کی آرزو
جی رہی ہے کسی یاد کا منظرِ ہم سفر اوڑھ کر

وہ مجھے ہی نہتا سمجھ کر ملا اور کس شان سے
میرے بخشے ہوئے حرف ہتھیار کو سر بسر اوڑھ کر

ہیں یہ احساس ثروت کی گم گشتگی کی زیاں کاریاں
گھر کا گھر ہی مگن، بے خبر ہے ردائے خطر اوڑھ کر

دکھ میں کمھلا گئے سکھ میں پھول آ گئے شاخِ جاں پر سدا
زندگی ہم بسر کر رہے ہیں ادائے شجر اوڑھ کر

ان کے دم سے ہی فیروزؔ تابندگی زندگی میں ہے جو
شب کی ظلمات میں جی رہے ہیں ردائے قمر اوڑھ کر

غائر عالم

مشتِ غنچہ سے نکل شاخ سے اُٹھ رنگ بدل
بادِ نو روز ہے اب اپنے ہی انداز سے چل

اک نئی ہستیِ رخشندہ کی لو تابندہ
پیکرِ خاک ہٹا نورِ فلک خیز میں ڈھل

ہر تصور کی غرض میں رہا محبوس بشر
اب ہوئی فطرتِ بے باک کی ضو عزّ و جل

فکر آزاد ہوئی اور کھلے دست و پا
سانس لی کھول کے دل طبع رہی کیا بوجھل

پچھلی اقدار نے جی بھر کے پیا خونِ جگر
اب کھلا آبِ حیات اور چلا زیست کا جل

یہ گروہ بندیٔ افراد نہیں کارِ حیات
دورِ افلاک کی لے سینے تہہِ دشت و جبل

ملک و اقوام گئیں نسل گئی رنگ گیا
عالم آباد ہوئے خیر سے اب فکر و عمل

☆☆☆

افتخار شفیع

جدید ہوتے ہوئے کہنہ سال آدمی ہوں
میں آپ اپنے لیے اک سوال آدمی ہوں

مری تلاش میں پھرتی ہے ریگِ صحرا بھی
میں اپنے دشت میں ہوں اور غزال آدمی ہوں

مجھے پکار کے دیکھو کسی شبستاں سے
میں اپنے عہد کا روشن خیال آدمی ہوں

مجھی سے روشنی پاتے ہیں اختر و مہتاب
شبِ سیاہ میں سورج مثال آدمی ہوں

مجھے بھی نخلِ تمنا کی رہگذار میں دیکھ
میں برف زار میں پتوں پہ شال آدمی ہوں

کسی پہ آج تلک کھل سکا نہ عقدہ مرا
میں دوستوں کے لیے اک سوال آدمی ہوں

بہت سنبھال کے رکھو مجھے کہ میں صاحب
عروج دور میں محوِ زوال آدمی ہوں

☆☆☆

افتخار شفیع

میانِ رہزن و رہبر مجھے نہیں معلوم
یہ کون ہے مرے اندر مجھے نہیں معلوم

ستارہ وار چلا تھا دیارِ خواب کی سمت
اب آ گیا ہوں کہاں پر مجھے نہیں معلوم

گزر رہا ہوں کسی قریۂ جمیل سے اب
بہشت ہے کہ ترا گھر مجھے نہیں معلوم

میں تجھ سے دُور کسی شہرِ نارسا میں ہوں
میں کس لیے ہوں یہاں پر مجھے نہیں معلوم

ذرا سی دیر کو مدہم ہوئی چراغ کی لَو
پھر اس کے بعد کا منظر مجھے نہیں معلوم

لیے تو پھرتا ہوں اک وسعتِ نظر کو میں
یہ عشق ہے کہ سمندر مجھے نہیں معلوم

بس اک اڑان کی خواہش نے آ لیا تھا مجھے
کہاں گئے مرے شہپر مجھے نہیں معلوم

اسلم سحابؔ ہاشمی

کاجل بھری آنکھوں میں راتیں بھی سویرے بھی
اُمید کے ہاتھوں میں ہیں غم کے پھریرے بھی

کچھ دے کے ہی لیتے ہیں یہ باغ بہاروں کو
جتنے ہیں سمیٹے تھے رنگ اتنے بکھیرے بھی

اک دشت سے گزرے تھے معلوم ہوا ہم کو
ہیں خضر کی صورت میں رہزن بھی لٹیرے بھی

ہو تیرے اجالوں کی اے صبح درخشاں خیر
اک خوف گہن کا ہے ڈرتے ہیں سویرے بھی

بارود کو سمجھا ہے ، انسان بقا اپنی
اِس سوچ پہ ہنستے ہیں، یہ گہرے اندھیرے بھی

اسلم سحابؔ ہاشمی

سوچوں کی چلمنوں میں جو خوابوں کے عکس تھے
ویران وادیوں میں بھی باغوں کے عکس تھے

پھر دل میں کوئی آ کے ہوئی خیمہ زن بہار
گل رنگ خوں میں کب یہ شرابوں کے عکس تھے

اب تشنگی کا جا کے مداوا کریں کہاں
دریاؤں کی تہوں میں سرابوں کے عکس تھے

سندیس دور دیس کا پہنچا چمن میں جب
پھر چہرۂ خزاں پہ نقابوں کے عکس تھے

آثار یہ قدیم زمانوں کے ہیں سحابؔ
خیمے نہیں نظر میں ، طنابوں کے عکس تھے

☆☆☆

اسلم سحابؔ ہاشمی

وہ پرانے راستے دیرینہ یاروں کی طرح
اب بھی میری راہ دیکھیں میرے پیاروں کی طرح

لٹ گئی تاروں کی مالا صبح کی آمد کے ساتھ
ملتے ہیں قزاق یوں بھی غمگساروں کی طرح

بھید ہے دنیا مگر اس بھید میں بھی بھید ہیں
بات سیدھی بھی یہاں ہے استعاروں کی طرح

دامنِ دل میں تو پھولوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا
چھید کرتے ہی گئے گل پھول خاروں کی طرح

روگ سے خالی نہیں دنیا میں کوئی دل سحابؔ
آج کا انسان ہے زندہ مزاروں کی طرح

ظفر اقبال نادرؔ

میری فطرت وفا کا مادہ ہوں
راستہ ہوں ، بڑا کشادہ ہوں

زندہ رہنا بھی چاہوں ، مرنا بھی
کتنا پُر پیچ ، کتنا سادہ ہوں

ٹوٹتا ہوں میں بار ہا جُڑ کے
کسی مے کش کا اک ارادہ ہوں

دل میں ہنستا ہوں تیرے وعدوں پر
میں تری سوچ سے زیادہ ہوں

ہارنے جیتنے سے مجھ کو کیا
اے بساطِ جہاں ! پیادہ ہوں

چھوڑنا مجھ کو تیرے بس میں نہیں
تیرے پیکر کا میں لبادہ ہوں

نہیں کچھ فرق تیرے جانے سے
یاد آیا ، سُنو ! میں آدھا ہوں

گم رہوں ذات کے نشے میں ظفرؔ
خود ہی ساقی ہوں خود ہی بادہ ہوں

☆☆☆

راؤ وحید اسدؔ

دریا جو دل کا تھا وہ روانی میں آ گیا
میرا بھی نام اس کی کہانی میں آ گیا

محوِ نظر تھا میں بھی جزیرے کی اوٹ سے
یک دم اُتر کے چاند بھی پانی میں آ گیا

ہم خوشبوؤں کے یار و طلب گار کیا ہوئے
پھر سے غرور رات کی رانی میں آ گیا

جو کرب جھیلنا تھا بڑھاپے کی عمر میں
وہ سانحہ بھی میری جوانی میں آ گیا

شہرِ جنوں میں اب کے کچھ ایسی ہوا چلی
گرد و غبار اُس کا نشانی میں آ گیا

اب کیا کسی کے ہجر کا شکوہ کریں اسدؔ
جب موڑ اس کے دل کی کہانی میں آ گیا

راؤ وحید اسدؔ

ہوا مہمیز ہوتی جا رہی ہے
جلن بھی تیز ہوتی جا رہی ہے

کسی کی یاد کی اب تیز بارش
سخن آمیز ہوتی جا رہی ہے

نجانے کون اُترا ہے زمیں پر
ہوا گل ریز ہوتی جا رہی ہے

یہ کس کی بات ہے جو میرے دل پر
اثر انگیز ہوتی جا رہی ہے

اسدؔ شعر و سخن میں اب زمیں بھی
مری زرخیز ہوتی جا رہی ہے

☆☆☆

نظمیں

یونس جاوید

گوانتاناموبے.....کالا پانی

آہنی دیوار میں سو چھید، بے چھت پنجروں میں
بیڑیوں میں سنگ بستہ
ہاتھ زنجیروں سے بوجھل، نزع کی سولی پہ سر رکھے وہ سب کیا سوچتے ہوں گے؟

آنکھ بھی چہرے پہ حیراں
بے زبانی، بے بسی، انسانیت کی
یوں کبھی دیکھی سُنی ہرگز نہ تھی!
ایک نشّہ، اپنی طاقت کا گھمنڈ، اُس کے مقدر کو سیہ کرتا ہوا
ظلم کا جمتا لہو
اور جبر کی تاریخ لکھنے کو تذبذب کا شکار
سب مہذّب، صاحبِ دل، سانس روکے
عالم سکرات میں ہیں منتظر
آج کے انساں کی آنکھوں میں لہو اُترا تو ہے
پر ضعیفی کی سزا میں
اپنی آنکھیں، ڈھانپ لیتے ہیں سیہ چشموں سے لوگ
منمناتے، عقلِ کُل کے دیوتا تو ہیں، مگر
بے جان، بے معنی محبت کی طرح، سب کھوکھلے الفاظ کا جادو جگانا چاہتے ہیں،

اور دکھاوے کی تسلّی کے لیے
زخم تازہ سہہ رہے ہیں
گولیوں کے پیٹ میں اُگتا ہے جن کا رزق
کیسے سورما ہیں؟

میں مہذّب!
میں ہی منصف!!
میں مگر جابر بھی ہوں!!!
آج کی طاقت بھی ہوں!!!
میں خدا ہوں!
میں تکبر کی دلیل!!
مجھ کو اپنی آنکھ میں بھر کر جھکو تب تک
کہ میں تہذیب کی اُس آخری منزل پہ جا پہنچوں
جہاں ہر خون کے بدلے میں
اُگتا ہے زوال____

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

آئینہ خانے کا قیدی

میں آئنوں کے حصار میں ہوں
اک عکس کی طرح
ان میں جڑا ہوا ہوں

جدھر بھی اُٹھتی ہیں
میری نظریں
خود اپنے چہرے کو دیکھتا ہوں
ہر اک پیکر
ہر ایک ہیولا
ہے میرا پیکر
مرا ہیولا
یہ سارے پیکر
یہ سب ہیولے
سب اپنے اپنے سروں پہ اپنے عذاب اُٹھائے
دُرونِ پیراہنِ دریدہ
ستارۂ زخمِ جاں چھپائے
لبوں پہ حرفِ دُعا سجائے
کسی چھناکے کی جستجو میں
کھڑے ہیں کب سے
بس ایک پتھر کی آرزو میں

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

نیا فکری تجزیہ

مری سرزمیں استعاروں کے اسراف کی داستاں ہے
یہاں کی علامات ظلِ الٰہی کے طاغوت کی ترجماں ہیں
یہاں علم پر جہلِ مطلق کی بدرنگ مہریں لگی ہیں
یہاں سب سے آگے فقط راشی و مرتشی ہیں
خزانوں پہ بیٹھے ہوئے اژدہوں سے
ضعیفی کے ہاتھوں ستم آزمودہ ہزاروں برس سے لڑے جا رہے ہیں
غریب الدیاری کے لمحات کتنے کڑے جا رہے ہیں
یہ کیسی زمیں ہے کہ جس کی بہاروں سے لذت کا ذرہ بھی حاصل نہیں ہے
یہ کیسا سماجی تصور ہے جس میں توازن کی ابجد بھی شامل نہیں ہے
طلسمِ عقاید کے خونخوار پنجوں میں محروم انسان جکڑے ہوئے ہیں
یہ کیسی مشیت ہے جس کی رسن کو خدا کے پرستار پکڑے ہوئے ہیں
سیاست کی زرکار شوخی تو دیکھو کہ مجہول چہرے حسیں ہو چکے ہیں
جو دانش وری کے سنگھاسن پہ بیٹھے ہیں وہ خود کو ظلمات میں کھو چکے ہیں
ہزاروں برس کی کتھاؤں سے مفلوج ذہنوں کو آزاد کرنا ہنر ہے
یہی ہے عبادت، یہی فرضِ انساں یہی نخلِ فکر و نظر کا ثمر ہے
برنگِ تکلم، بطرزِ تبسم مخالف کو اپنا بنانا ہی فن ہے
ہمالہ بھی اک دن کفِ آشتی پر اُٹھا کر دکھا دیں اگر کچھ لگن ہے
مگر عہدِ ملا جو روشن ضمیروں کا دوزخ ہے اس کو ارم زار کر دو
فسادی عقاید کی توپیں جہاں ہوں انہیں پہلی فرصت میں بیکار کر دو

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

بے روزگاروں کو دیکھ کر

دھوپ کی شدت میں بیٹھے ہیں کہ باری آئے گی
افسر شعبہ کی دفتر میں سواری آئے گی
ہاتھ میں تھامے ہوئے مایوس لفظوں کے ورق
دل میں اُمیدوں کی دھڑکن، جسم غرقابِ غرق
چند بندوں کی جگہیں اور اس قدر بے روزگار
حیف اے مجبور انساں حیف اے پروردگار!
خون سے اپنے بڑھایا ماں نے جس بیٹے کا قد
اس کا قرضہ کیسے دے مجبور بیٹے کی سند
گھر میں بہنوں کی وہ غم آلود آنکھیں الاماں
باپ بوڑھا چھوٹے بھائی مدرسوں کے درمیاں
سب کی اُمیدوں کا سورج اک جواں بے روزگار
آہ اے مجبور انساں آہ اے پروردگار!
چلچلاتی دھوپ، مہنگائی، ضرورت کا عذاب
کون کھینچے سائبانِ زر کی بوسیدہ طناب
چند آسامی کی سیکڑوں کا انتخاب
دال روٹی کی ضمانت دے گی کیا ادنیٰ کتاب
کون جانے عیش کے بازار میں غربت کی مار
حیف اے انسان خاکی حیف اے پروردگار

☆☆☆

سجاد مرزا

یادِ ماضی

مری محبت کا مرثیہ ہے ، تری جوانی کی آہ و زاری !
یہ زندگی ہے کہ جیسے برسوں کی ایک فاقہ زدہ کنواری
میں یوں تو کہنے کو جی رہا ہوں مگر ہے جینے میں آج خواری
حیات روتی ہے ، چیختی ہے ، تڑپ رہی ہے غموں کی ماری

میں وہ ہوں پاگل کہ جس کی باتیں سنے جو کوئی تو مسکرائے
مری سسکتی ہوئی تمنا نے سیکڑوں ہی فریب کھائے
یہ وہ جہاں ہے اے جانِ شاعر کہ جس میں اپنے بھی ہیں پرائے
کرے جو پھولوں کی آرزو تو وہ ڈھیر کانٹوں کا لے کے جائے

مری تباہی کا تذکرہ ہے ، تری جوانی کی داستاں ہے
وہ دن محبت کے اب کہاں ہیں؟ یہاں یہ چاروں طرف دھواں ہے
حسین صبحوں کی ، چاند راتوں کی دل کشی کا سماں کہاں ہے؟
بس اب تو ہر شخص کے لبوں پر میں دیکھتا ہوں کہ اک فغاں ہے

یہ رنج و غم کی کہانیاں چھوڑ ، یادِ ماضی میں ڈوب جائیں
اسی بہانے سے دو گھڑی ، آ اے جانِ شاعر سکون پائیں

☆☆☆

محمد انور خالد

بخت خاں آنکھ اُٹھاؤ

بخت خاں آنکھ اُٹھاؤ کہ ہرا جنگل ہے
آسماں گیر درختوں نے نظر کی حد کو
روک رکھا ہے کہ اب آنکھ زمیں پر اُترے
بخت خاں آنکھ اُٹھاؤ کہ ہوا پاگل ہے
اسی موسم میں کسی شاخِ گرہ دار کے بیچ
وہ بدن جھول گیا
جس نے تلوار کو گردن میں حمائل نہ کیا
وہ بدن جھول گیا شاخِ گرہ گیر کے بیچ
بخت خاں آنکھ اُٹھاؤ کہ کہانی نہ رہی
قصہ گو ختم ہوئے قصۂ طولانی سے
ہم نے گرتی ہوئی تہذیب کی مشکیں کس دیں
ہم اجل دیدہ، پدر سوختہ، آوارہ نصیب
ہم نکالے ہوئے، پھینکے ہوئے، بھاگے ہوئے لوگ
ہم جسے یاد کریں اس کی قضا آتی ہے
ہم جسے یاد کریں اس کی خبر کوئی نہیں
بخت خاں آنکھ اُٹھاؤ کہ غنیمت ہے بدن
شاخ گرہ دار کے بیچ
ورنہ ہم سوختہ جاں شعلہ نصیب
ہم جسے یاد کریں اس کی قضا آتی ہے
ہم جسے یاد کریں اس کی خبر کوئی نہیں

☆☆☆

محمد انور خالد

وہی اسبابِ بغاوت لکھے

میں نے گرتی ہوئی دیوار پہ تحریر کیا
جس نے آثار الصنادید لکھی ہو وہی_____
اسبابِ بغاوت لکھے
اس سے پہلے مگر اک رسمِ ملاقات بھی ہے
یہ بڑھاپے کی سزا ہے کہ جوانی کا عذاب
طشت میں پھول ہیں اور سر پہ سورج کا سفر
اور جو باقی ہے وہ عیار کی زنبیل میں ہے
میں محلات و عمارات سے تجرید کیا
جس نے تاریخ فرشتہ لکھی
وہی دربارِ عزازیل کا قصہ لکھے
خط کوفی میں لکھے شام کے بازار کا حال
نسخ میں فلسفہ و فکر کی تنسیخ لکھے
خط عارض میں لکھے حلقۂ گردن کی گرفت
اسی گردن کی جو عیار کی زنبیل میں ہے
میں نے زنبیل پہ تحریر کیا
جس نے آثار الصنادید لکھی ہو
وہی اسبابِ بغاوت لکھے

☆☆☆

دل نواز دلؔ

نظم سے پہلے نثر

لاہور کے الحمرا ہال نمبر III میں سارک رائٹرز کانفرنس منعقدہ ۱۲/مارچ تا ۱۴/مارچ ۲۰۰۴ء کی افتتاحی تقریب کے موقع پر احمد فرازؔ نے بحرِ جنت میں جو گلوں میں رنگ بھرتی اور بادِ نوبہار میں خوشبوئیں بکھیرتی نظم پڑھی، میری یہ نظم اسی کا تسلسل ہے لیکن ایک نمایاں توقف کے ساتھ! ویسے احمد فرازؔ کی متذکرہ نظم سن پچاس کی پہلی دہائی میں پنڈت جواہر لال نہرو کی موجودگی میں دہلی کے ایک بھرپور مشاعرے میں اُستاد دامنؔ کی زار و قطار پڑھی گئی پنجابی نظم کی بازگشت ہے۔ اُستاد دامنؔ کی نظم اب مجھے یاد نہیں آ رہی لیکن اُس نظم کا ایک بچا کھچا ٹکڑا اب بھی میرے ذہن پر نقش ہے

روئے تُسی وی اَو روئے اَسی وی آں

(اور شاید اس کے بعد تھا) موئے تُسی وی او موئے اسی وی آں ___ وغیرہ وغیرہ۔

اس نظم کو سننے کے بعد بقول راوی پنڈت نہرو نے استاد دامنؔ کو بھارت میں رہ جانے کی پیشکش کی، جو اُستاد دامنؔ نے ایجاب کے باوجود قبول نہ کی۔ شاید پنڈت جی نے اس نظم کو بھارت کی اکھنڈتا یا ایکتا کا پیش خیمہ جانا ہو اور اُستاد دامنؔ پنڈت جی کے من کی بات جان گئے ہوں۔ اس مشاعرے کے انعقاد میں مرحوم راجہ غضنفر علی خان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ راجہ صاحب کے نام کے اوپر جو نقطے ہیں اُنہوں نے شوشے کا نشان مٹانے کی بہت کوشش کی مگر یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہو سکی کہ پنڈت جی کا کشمیر کے بارے میں بات کر کے مُکر جانا صحیح معنوں میں ایک شوشہ ثابت ہوا جو آج تک قائم ہے اور جس کا خمیازہ آج تک دونوں طرف کے غریب، نادار اور مجبور عوام بھگت رہے ہیں اور جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔ خدا کرے یہ شوشہ مٹ جائے اور بات اپنے منطقی انجام تک پہنچے۔

احمد فرازؔ کی نظم بعنوان ''ہندوستانی دانشوروں کے نام دوستی کا ہاتھ'' پر کہی گئی میری یہ نظم ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے'' اُن امیر پاکستانی اور ہندوستانی شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کے نام ہے جنہیں دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی پینگیں بڑھانے کی بڑی شتابی ہے۔ میری یہ نظم اُن غریب پاکستانی اور بھارتی عوام کے لیے بھی ہے۔ جن کی ہر خرابی کا باعث ہم سب ہیں اور جس کا سب سے بڑا سبب کشمیر کا تنازع ہے۔ دوستی کرنا فعل جائز ہے لیکن دانشوروں کا دوستی کے پردے میں کشمیر کے تنازع کا چھپانا کوئی دانش مندانہ اقدام نہیں بلکہ ایک کھلی حقیقت سے آنکھیں چرانا یعنی نظریں چھپانا ہے جو دوستی نہیں دشمنی ہے۔ اب مصلحتوں کا وقت نہیں بلکہ سیدھی سادھی اور اصلی بات کرنے کا وقت ہے جس کے اُصول حق اور سچ کی بنیاد پر وضع کیے جانے ہیں۔ فقط شاعری یا لفاظی پر نہیں۔ جلدی کے آگے کھائی ہے تو دیری کے پیچھے کھڈا! عمل میں اعتدال ہو تو بات معتدل ہوتی ہے۔ یہ بات علم کی نہیں آگاہی کی ہے۔ الخ۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

وہی ہے رُت وہی موسم وہی جہان اپنا
ہے آس تم کو نہ اُمید ہے کوئی ہم کو
جو رنج ہم کو ہے تو خوش نہیں کوئی تم بھی
نہیں یہ جھوٹ یہ سچ ہے ذرا سا تو دم لو

تمہارے گھر میں بھی جلتے ہیں حسرتوں کے چراغ
دھواں دھواں ہیں ہمارے مکان میں بھی دیے
تمہاری آنکھ میں بھی اشک اشک خواب ہوئے
ہمارے دل نے بھی ساغر لہو کے بھر کے پیے

تمہارے خواب حقیقت کا رُخ نہ دیکھ سکے
ہماری بات بھی اب تک بنائے سے نہ بنی
تمہاری دید پہ کالی گھٹا کا ابر ہے اور
ہمارے دل پہ بھی ہے بادلوں کی چھاؤں گھنی

تمہاری رہ میں سد اکیکروں کی نوک رہی
ہماری چاہ میں کانٹے چبھو گئی منزل
تمہیں یہ زعم کہ ہو میر کارواں تم اور
ہمیں یہ ناز کہ ہم ہیں سفر کا کُل حاصل

نہ تر گلاب میں وہ تازگی لہو کی رہی
نہ تر سمن میں طراوت جو صبح دم تھی کبھی
نہ قربتیں وہ رہیں اور نہ فاصلے وہ رہے
کہ دُور دُور ہیں اب ایک دُوسرے سے سبھی

نہ دل کے درد کو شعلہ بنائے ہے شبنم
نہ باغ باغ ہے دل اب نہ پھول پھول نظر
نہ جنگ سے کوئی جیتا نہ امن سے ہارا
نہ آج کا ہے پتہ اور نہ کوئی کل کی خبر

تمہیں ہے شوق چٹان اور باز بننے کا
کہ تم سمجھتے ہو ہر اک کو فاختہ دیکھو
پہاڑ جن پہ تمہیں ناز ہے زمانے کا
وہی پہاڑ ہیں اپنے بھی پاسباں سوچو
تمہارے لوگ ہمارے بھی یار ہیں یارو
غریب اور ہیں نادار یہ بھی ہم جیسے
دیئے جو اِن کے اندھیرے گھروں میں جلتے ہیں
وہ لَو لگا کے دکھاتے ہیں خواب ہی پیارو
دیئے جلاؤ وہ تاباں کریں جو احساں کو
دیئے جو لَو میں لگائیں ضیائے عدل سے دل
دیئے جو جَل کے کریں دشتِ امن کو روشن
دیئے کہ جن سے ہو پُر نور پھر وہی محفل
ہمارے دستِ محبت کو تھام لو دل سے
کرو خیال ہے کشمیر حل طلب اب تک
نہ دوستی ، نہ محبت ، نہ چاہتیں ہوں گی
رہے گا گھر میں تنازع ہوا نہ حل جب تک

اگر ہے ساتھ کی خواہش تو ہاتھ ہاتھ میں دو
اگر ہے دل سے کھلی دوستی کی چاہ تمہیں
تو آؤ مل کے چنیں راہ کے سبھی کانٹے
نظر ہمیں نہ لگے تا لگے نہ آہ تمہیں

☆☆☆

یونس متین

سمپُورن سمپُورن منوا

سمپُورن سمپُورن دنیا
آرو ہی امرو ہی سانس
ساون جیسی آنکھ نشیلی
بارش جیسی ہُوک،
کومل سُروں کا آنچل اوڑھے
عمر چلی ہے
تیور دکھوں کے ساتھ
ریشم پیروں میں چھنکاتی
سرد کٹیلی کالی رات
جیون دکھ کا ٹھاٹھ

ایک کنارے ماجھی بیٹھا
دوجی سمت ہے آپ
بیچ میں ایک سمندر جس کا
انت نہ جانے کو
لہر لہر_____
لہراتی آس پہ چلتی تیز ہوائیں
موج موج اک میل کی خوشبو
پگ پگ اک ہونی سے لے کر
انہونی تک بات

اک چٹکی میں خواب ادھورے
اک چُٹکی میں آگ
جوں صدیوں کی راکھ

سمپُورن سمپُورن منوا
اوڑھ وَ جس کا لیکھ
کبھی کبھی گم ہو جائے سُر
نیر سمندر ہو
آسمان کی بات ہمیشہ
آسمان پر ہو_____"

یونس متین

داستان گو

آگ جلتی رہی
گلخنِ وقت میں
رات بھر آگ جلتی رہی
اور حلقہ نہ ٹوٹا
زمستاں کی بیوہ ہوائیں
اندھیروں کی لاشوں سے دست و گریباں
ٹھٹھرتی ہوئی سرد گاؤں کی گلیاں
خموشی کے بستر پہ سوئی ہوئی
کُہر کی بوڑھیاں
اور چوپال میں ____
ہر کوئی منتظر
اور بے چین تھا
کہ ادھوری کہانی سے پردہ اُٹھے

داستاں گو نے سر کو اُٹھایا
خموشی کو توڑا
تنا قل ہٹایا
سلگتی تڑکتی ہوئی لکڑیوں کو نظر بھر کے دیکھا
تو گویا ہوا
''کہ پھر ایسے ہوا اُس جواں سال کی بوڑھی آنکھوں میں
سارے مناظر گزرنے لگے

اور وہ کہنے لگا ____ یاد ہیں مجھ کو
متھرے کے پیڑے، بنارس کی ساڑھی، علی گڑھ کے تالے، حسیں سنگترے
ناگ پور کے، وہ ڈھاکہ کی ریشم سی ململ، الہ باد کے شہدا مرود
کشمیر کے سیب، دہلی کے بانکے، سہارن پوری آم،
جوتے چمکتے ہوئے کان پور کے وہ میرٹھ کی کٹ کٹ کترتی ہوئی قینچیاں
میری بیوی کے پستان، بھائی کی آنکھیں، بہن کا دوپٹہ، وہ بیٹے کے بازو
لپکتی کٹاریں لہو میں نہاتی ہوئی برچھیاں
دستِ آتش میں جلتے ہوئے بام و دَر ____ قافلے
یاد ہیں سب مجھے،
داستاں گو
کہانی کے اس موڑ پر
سارے احباب کو چھوڑ کر
جلتے شعلوں میں پھر کھو گیا
اور چپ ہو گیا
آگ جلتی رہی ____ رات بھر آگ جلتی رہی
دُور خاموش گلیوں میں کتوں کے لڑنے کی آواز آتی رہی ____''

☆☆☆

غائر عالم

ہرجائی

اے گلِ باغِ مراد
رنگِ بےخوشبو بےرنگ
ہے بوباس تری
نرمیِ لمسِ یدِ برگ ہے بےلطف
مزہ خار کے چبھنے میں نہیں
جلوہ آرائی نہیں تڑپاتی
تو کہ بےگانۂ خود
شاد بہ صد برگ وساز
شگفتہ ہے
کھلا جاتا ہے
اور اک بھونرا
تہہِ دل میں پڑا
لیتا ہے رس چھپ کے
نمو یابیِ فطرت کا تری

خالد ریاض خالدؔ

شہر کی تنہائی میں

بھیگی خواہشوں کی چاہ میں
رسوائی دُور تک تعاقب میں آتی ہے
چاندنی اور وحشت میں ڈوبی راتوں نے
اندرون ایک اَن دیکھی خندق کا سراغ پایا ہے
ایک مٹی کے بدن پہ
کتنی دراڑیں پڑ سکتی ہیں
آنکھیں، پیشانی اور دل
خلش کا لبادہ اوڑھے
شہر کی تنہائی میں لاوارث ہیں
جیسے ہارے ہوئے شخص کے آگے
کوئی راستا نہیں ہوتا

☆☆☆

حروفِ زر
(قارئین کے خطوط)

اپریل ۲۰۰۴ء کا شمارہ موصول ہوا۔ ''انگارے'' کے توسط سے قاضی جاوید صاحب کا ''پاکستان کی موجودہ صورتِ حال اور تاریخ کے مطالعے کی اہمیت'' کے عنوان سے خطاب پڑھنے کو ملا جس کے لیے آپ شکریے کے مستحق ہیں۔

قاضی صاحب نے درست فرمایا کہ ہم نے تاریخ کا بوجھ پشت پر لاد رکھا ہے لیکن اُس کو جاننے کی، اُس کو سمجھنے کی اور اُس سے سبق سیکھنے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے جو بنیادی سوال اُٹھایا وہ یہ ہے کہ کیا تاریخ سے واقعی کوئی سبق سیکھا جاسکتا ہے؟ یا یہ کہ آیا ہم تاریخ سے کوئی حقیقی اور بامعنی رہنمائی لے سکتے ہیں؟ اور اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر ہم تاریخ سے سیکھنے کے لیے خطرات مول لینے کے لیے تیار ہوں تو تاریخ ہمیں عملی افادیت رکھنے والی بےمثال دانائی دے سکتی ہے۔ قاضی صاحب کی یہ باتیں بالکل بجا ہیں۔

لیکن پاکستان کی موجودہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے، میرے خیال میں اس سوال سے کہ کیا تاریخ سے کوئی سبق سیکھا جاسکتا ہے؟ پہلے زیادہ اہم سوال ہمارے لیے یہ ہے کہ کیا تاریخ سے ہم کوئی سبق سیکھنا چاہتے بھی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ فلسفیانہ مباحث سے قطع نظر، تاریخ لوگوں اور قوموں کو اگر سب کچھ نہ سہی مگر پھر بھی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ یہاں مجھے فیدل کاسترو کا وہ بیان یاد آ رہا ہے جو انہوں نے ۱۲/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے دیا۔ اُنہوں نے کہا ''جنابِ صدر! تاریخ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ جب ایک قوم نوآبادیاتی اور نئے نوآبادیاتی نظام سے اپنے آپ کو آزاد کرکے خودمختاری حاصل کرتی ہے، تو یہ عمل بیک وقت ایک طویل جدوجہد کا آخری عمل بھی ہے اور ایک نئی، جانفشاں جنگ میں پہلا مرحلہ بھی۔۔۔'' تاریخ کا یہ سبق فیدل کاسترو نے سیکھا مگر ہم نے نہیں۔ آخر کیوں؟

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ تو سبق سکھاتی ہے۔ جب بھی، جس قوم نے تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہا، تاریخ نے ممکنہ حد تک اور طرح طرح سے اُس کی رہنمائی کی۔ بلکہ تاریخ کا تو یہ عالم ہے کہ وہ ازخود ہماری کئی طرح سے امداد کرتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان دنیا میں اپنے مقام کا شعور تاریخ ہی کی مدد سے حاصل کرتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کے مطابق اپنی پوزیشن کے شعور کے لیے یہ جاننا لازم ہے کہ دنیا کس طرح اس مقام تک پہنچی، جہاں سے ہمارا انفرادی حافظہ شروع ہوتا ہے۔ مذاہب، ادارے اور قومیں کس طرح مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی صورت پذیر ہوئی ہیں، ادوارِ گزشتہ کے عظیم افراد سے شناسائی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عقیدوں اور رواجوں سے مختلف عقیدوں اور رواجوں کو جاننے کے لیے بھی تاریخ ہی ہماری مدد کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ تاریخ بہت کچھ سکھانے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ اصل

مسئلہ افراد کا یا قوم کا تاریخ سے کچھ سیکھنے کے لیے تیار ہونا ہے اور ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم تاریخ سے کچھ سیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔

یہ درست ہے کہ تاریخ کے بعض گوشے گونگے ہوتے ہیں اور ہم اُن کی ٹھوس سچائیوں تک نہیں پہنچ پاتے اور اُن سے کچھ نہیں سیکھا جاسکتا مگر ساری کی ساری تاریخ گونگی نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی سارا تاریخی ڈیٹا ناقابلِ حصول ہوتا ہے اور پھر خاص طور پر ہماری تاریخ کے تو اکثر گوشے ایسے ہیں جو بالکل واضح اور عیاں ہیں۔ اس قدر واضح کہ بعض گوشے تو پکار پکار کر سبق سیکھنے کی التجائیں کرتے ہیں مگر ہم ایسے بہرے ہیں کہ تاریخ کی ان التجاؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

اصل میں ہم نے اس قدر طویل اور مسلسل تاریکی کو جھیلا ہے کہ اب ہم اس گہرے اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئے ہیں اور اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب اندھیرا ہمارے اندر گھبراہٹ اور بے چینی کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔ یوں ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ شعور پیدا ہی نہیں ہو پاتا کہ ہم اندھیروں کے باسی ہیں اور ان اندھیروں کے باہر کہیں روشنی بھی ہے۔

اس لیے میرے خیال میں ہمارا فوری مسئلہ صرف یہ نہیں کہ تاریخ کوئی سبق سکھا سکتی ہے یا نہیں؟ بلکہ ہمارا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم تاریخ سے کچھ سیکھنے کے لیے تیار ہیں بھی یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو کیوں؟ اور یہ کہ ہمیں تاریخ سے سیکھنے پر کیسے مائل کیا جاسکتا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''لوگ تاریخ سے سیکھتے ہیں مگر وہ صرف وہ باتیں سیکھنا چاہتے ہیں کہ جن سے اُن کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔'' یعنی اگر ہم تاریخ سے سیکھتے بھی ہیں تو ہمارا یہ عمل مفاد پرستانہ ہوتا ہے۔ جو نہ صرف انتہا درجہ کا ادھورا ہوتا ہے بلکہ بہت زیادہ خطرناک بھی ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ سیکھنے کا یہ عمل ایک مخصوص گروہ تک محدود رہتا ہے۔ اس سے عوام یا انسانیت کو کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ پاتا۔ لہٰذا سیکھنے کا یہ عمل قوم کے لیے بیکار ثابت ہوتا ہے بلکہ اس مخصوص گروہ کے سیکھنے کے ایسے عمل نے بھی عام لوگوں کو تاریخ سے کچھ سیکھنے سے دُور کر رکھا ہے اور اپنے مفادات کے حصول کے لیے تاریخ جیسے وسیع علم کو ایک محدود دائرے میں مقید کر دیا ہے۔

ہمارے مورخین اور تاریخ کے دانشوروں کا جہاں یہ فریضہ ہے کہ وہ درست تاریخی حقائق کی نشان دہی کریں اور صدیوں سے لکھی جانے والی متعصّبانہ اور مفاد پرستانہ تاریخ نگاری کا پردہ چاک کریں، وہاں یہ فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریخ سے سبق سیکھنے پر مائل بھی کریں اور اس کے لیے ہمیں لوگوں میں سب سے پہلے جس شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ ایسی نہیں ہے جیسی کہ وہ جانتے ہیں یعنی بقول قاضی صاحب ہماری تاریخ کوئی ایسی عظیم الشان نہیں جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے۔ ہماری قوم میں تاریخی شعور کے فروغ کے لیے، میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ پہلا قدم ہے جو ہمیں اُٹھانا چاہیے کیونکہ جب اُنہیں یہ شعور ہو جائے گا کہ تاریخ کے بارے میں

وہ جو کچھ جانتے ہیں وہ کچھ زیادہ درست نہیں تو پھر وہ درست حقائق جاننے کی ضرور کوشش کریں گے اور ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سچی تاریخ دھندلائی جاسکتی ہے مگر یکسر مٹائی نہیں جاسکتی۔ لہٰذا جب لوگوں میں تاریخ سے سبق سیکھنے اور جاننے کی لگن پیدا کر دی جائے گی تو وہ تاریخ کے سچ کو کھنگالنے کی ٹھان لیں گے اور ہمارے مخلص مورخین کی مشکلات کو بڑی حد تک کم کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ ہمیں تو بس فی الحال لوگوں کو بار بار شدت سے اس چیز کا احساس دلانا ہے کہ وہ بے خبر ہیں اور حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ایک بات میں اکثر و بیشتر دہرایا کرتا ہوں کہ ہمارا معاشرہ ابھی تک جہالت پر مبنی ہے اور میرے خیال میں اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں بلکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور جہاں جہالت ہوتی ہے وہاں ہر شے سے جذباتی تعلق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ تاریخ سے ہمارا رشتہ جذباتی نوعیت کا نہ ہو۔ اس لیے ہمارے دانشوروں کو گہری معاشرتی نفسیاتی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس جذباتی فضا میں علم و تحقیق اور غور و فکر کی قندیل جلانا ہوگی۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام ہے مگر دیرپا اور دائمی نتائج حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔

ہمارے دانشوروں کا ایک اور اہم کام، جسے میں انتہائی مختصر الفاظ میں بیان کروں گا، یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کی ترجیحات کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں کیونکہ ہماری موجودہ ترجیحات نے جن اقدار کو فروغ دے رکھا ہے اُس میں تاریخ اور تاریخی شعور بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ سیکھنا سکھانا اور خاص طور پر تاریخ سے سیکھنا ہماری ترجیحات میں شامل ہی نہیں اور یہ ہمارا ایک بڑا المیہ ہے۔

(ایم۔ خالد فیاض۔ گجرات)

''انگارے'' شمارہ ۱۶ میں قاضی صاحب کا مضمون ''پاکستان کی موجودہ صورت حال اور تاریخ کے مطالعے کی اہمیت'' انتہائی سنجیدہ موضوع پر نفس آمیز انداز بیان کے ساتھ، یہ مضمون تاریخی خسارے کے ضمن میں تازیانہ آتشیں سے کسی طرح کم نہیں۔ واقعی! ۱۴ کروڑ افراد جن میں ۲۵ فی صد ارب پتی ہیں، باقی ۷۵ فی صد بھوکے ننگے عرب کے پجاری انہیں جغرافیہ یا تاریخ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس ملک کی ۷۵ فی صد افرادی قوت دھتورے کی طرح اُگتی رہتی ہے اور بالآخر اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ جتنے بڑے وحشت ناک قبرستان اس ملک میں ہیں، شاید ہی کہیں ہوں۔ لیہ میں ادارہ انسان دوست کے صدر اور دانشور جناب منور اقبال کہتے ہیں لندن کی جس لائبریری میں گئے انہیں کوئی کرسی خالی نہ مل سکی۔ ہمارے یہاں مردہ دفنانے کے لیے چار گز زمین میسر نہیں، لائبریریاں ویران بلکہ جوئے خانے، منشیات کے مرکز کے لیے ہر وقت تیار۔

ایسی یاجوج ماجوج مخلوق کو جب ہم سب فلسفہ اور عہد ساز شخصیتوں سے متعارف کرانے کی کوشش کرتے ہیں تو بجز ندامت کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی معروضی حقائق ہیں۔ اہل علم آخر کیوں سر پیٹتے ہیں کہ جہلا کو ایوارڈ دیئے جاتے ہیں، انہیں کیوں نہیں دیئے جاتے۔ ملک کو دیکھیں، اس کی

سیاسی، ثقافتی پالیسیاں دیکھیں، خوشامد، چاپلوسی، افسر شاہی کی سلامی کے طور طریقے سیکھیں تو ایوارڈ بھی ملے۔ (ایوارڈ کا مطلب رقم) تا کہ ۴۰ لاکھ کی گاڑی خرید سکیں۔ ایک طرف ترقی پسندی، جاگیرداروں کی مخالفت اور پھر انہیں پر تنقید کہ جہلا کو کیوں نوازتے ہیں علماء کو سلام کیوں نہیں کرتے۔

بھائی اصغر علی شاہ کی ہندی پر گرفت دیکھ کر حیرت ہوئی، شاہ صاحب ثقہ زبان ہیں۔ یار ہم بھی حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے لیکن اپنی بولی بھی بھول گئے۔ قاضی حبیب الرحمٰن اور خاور اعجاز کا کلام، پرویز ساحر کی غزل میں جدت، طارق عزیز اور پروفیسر محمد فیروز شاہ کی غزل، ڈاکٹر محمد امین، روش ندیم کے فکر انگیز کلام سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔

آپ ''انگارے'' کے ہر شمارے میں کارآمد اداریہ تحریر فرماتے ہیں اور کھری کھری سناتے ہیں۔ عامر سہیل صاحب ہم سب لوگ نیچر کے ساتھ زندہ رہنے کو کافی سمجھتے ہیں یعنی اس کا علاج، تغیر و تبدل، انقلاب وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔ اگر جاہل ہیں تو پڑھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ گندہ رہنا، گندی نالیوں کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی ہے تو پرواہ نہیں، سیکولرازم کو جسے دینی، خدا ناشناسی وغیرہ کے معنی اور مفہوم اگر سمجھ میں نہیں آتے تو اس کی تحقیق لازم نہیں۔ سردی گرمی کی کوئی پرواہ نہیں یعنی غیر منظّم قدرتی مظاہر کے ساتھ، حیوانی (نیچرل) زندگی ہمارا فلسفہ ہے، یہ انداز یا نظریہ یورپ کا نہیں۔

(ڈاکٹر خیال امروہی۔ لیہ)

''انگارے'' کا سولہواں شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اداریہ قابلِ غور تھا۔ آگہی آگ ہے، جس کی حدت روح و تن کو جِلا بخشتی ہے مگر صد حیف کہ گزشتہ چند برسوں سے ہمارے ہاں کے ادبا و شعراء کی نثریات و شعریات میں یہ آگ بجھتی چلی جا رہی ہے۔ محض فکری لیبارٹریوں میں لفظوں کی کلوننگ، کا کام جاری ہے۔ آخرش کب تک ہم ادھورے سچ کو پورا سچ سمجھتے رہیں گے؟ یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ہماری آگ کو کسی آگہی سے بحال کرے اور مکمل سچ کو برداشت کرنے کے لیے ہمیں توفیقاتِ خاص ارزانی کرے۔ آمین

اداریے میں خاور اعجاز کی ایک غزل (ع جذبۂ دل کی صدا کافی ہے) سے متعلق اُٹھائے گئے نکتۂ اعتراض کے جواب میں ''ایک ضروری وضاحت'' کے عنوان سے ہمارے مکتوب (مطبوعہ انگارے، شمارہ ۱۴، فروری ۲۰۰۴ء) کو توضیح تحریر کیا۔ جس میں خاور اعجاز کی مکتوبی رائے کے ساتھ ''انگارے'' کی طرف سے وضاحت کی گئی جس سے ہمیں قدرے تسلّی ہوئی۔ بہر حال اس وضاحت کے بعد بھی افتخار مغل قابلِ گرفت ہیں کہ اُن کے دیوان میں خاور اعجاز کی مذکورہ غزل کیونکر شامل ہوئی۔ یہاں ہم یہ بھی وضاحت کرتے چلیں کہ ہمارے اُٹھائے گئے نکتۂ اعتراض کا مقصد کسی بھی شخص کی تذلیل کرنا نہیں تھا بلکہ ایک شعری و ادبی مغالطے کی نشاندہی کرنا تھا۔

مضامین میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ایک رسمی اور نصابی مضمون تھا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ایک منفرد اُسلوب کے عمدہ نثر نگار ہیں۔ اُن کی باریک بینی اور معنی خیزی ہمیں متاثر کرتی ہے۔ رحمان مذنب کی ''خوشبودار عورتیں'' کے عنوان سے اُن کا مضمون پسند آیا۔ خاور اعجاز نے اپنے مختصر مضمون میں جدید نظم کے رجحانات کی بروقت نشان دہی کی۔ ایم خالد فیاض کا سیفو کی شاعری کے دیگر موضوعات کے حوالے سے تحریر کردہ مقالہ بہت مفصل اور جاندار تھا۔ اُنہوں نے جس طرح سیفو کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور تاریخی حوالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، اُس کی شاعری سے معنی تلاشنے کی کوشش کی، وہ قابل ستائش ہے۔ ابنِ حسن کا سلسلہ وار مضمون (جمالیات-۴) بدستور ہے۔ قاضی جاوید کا خطاب، اختلافی موشگافیوں کے باوجود پسند آیا۔ ڈاکٹر یونس جاوید کا سلیم شاہد (مرحوم) کے بارے میں لکھا ہوا خاکہ ہمیں اس لیے بھی اچھا لگا کہ مرحوم سے ہمیں ایک آدھ ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ حق مغفرت کرے بہت اچھے شاعر اور نفیس انسان تھے۔ غزلیات کا حصہ گزشتہ تین شماروں سے بہت بھرپور ہو گیا ہے۔ حصہ غزلیات میں اصغر علی شاہ (پہلی غزل)، قاضی حبیب الرحمٰن اور خاور اعجاز کی غزلوں کے زیادہ تر اشعار دل کو بھائے۔ نظموں میں اصغر علی شاہ اور ڈاکٹر محمد امین کی نظمیں اچھی لگیں۔ خصوصاً اصغر علی شاہ کی نظم جس میں اُنہوں نے ہندی لفظیات کو برتتے ہوئے تاریخ کو نظم کیا۔ حروفِ زر میں سبھی احباب کے مکتوبات علم افروز تھے۔

(پرویز ساحر۔ ایبٹ آباد)

اس شمارے کا سب سے اچھا مضمون میرے خیال میں ڈاکٹر یونس جاوید کا ہے، سلیم شاہد ایک خاصا اہم شاعر تھا مگر ناقدری کی دھول میں گم ہونے والوں میں اس کا بھی نام ہے۔ اس کی موت پر ڈاکٹر یونس جاوید کا یہ مضمون ایک سراہے جانے والی تحریر ہے۔ اس بار حصہ نظم، غزل خاصاً جاگتا ہوا ہے، اصغر علی شاہ، خاور اعجاز سے لے کر روش ندیم تک سبھی حضرات نے اچھی چیزیں پڑھنے کو دیں۔ افسانے بھی برے نہیں ہیں۔ ''انگارے'' کم صفحات میں معیاری ادب پیش کر رہا ہے یہ کوئی معمولی کام نہیں۔

(احمد صغیر صدیقی۔ کراچی)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)، ڈاکٹر معین الرحمٰن (لاہور)، ڈاکٹر رشید امجد (راولپنڈی)، ڈاکٹر نوازش علی (راولپنڈی)، احمد جاوید (راولپنڈی)، یونس جاوید (لاہور)، غلام حسین ساجد (لاہور)، عطا الرحمٰن قاضی (عارف والا)، فہیم شناس کاظمی (نواب شاہ سندھ)، افتخار عارف (اسلام آباد)، ناصر حسین بخاری (اسلام آباد)، صفدر علی شاہ (سرگودھا)، ایم۔ خالد فیاض (گجرات) ابن حسن (گوجرانوالہ)، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی (گوجرانوالہ)، کرنل دل نواز دلؔ (لاہور)، ڈاکٹر طیب منیر (راولپنڈی)، محمد اقبال نادر (عارف والہ)، محمد فیروز شاہ (میانوالی)، ڈاکٹر عارف ثاقب (لاہور)، مسز شاہین حسین (بہاولپور)۔